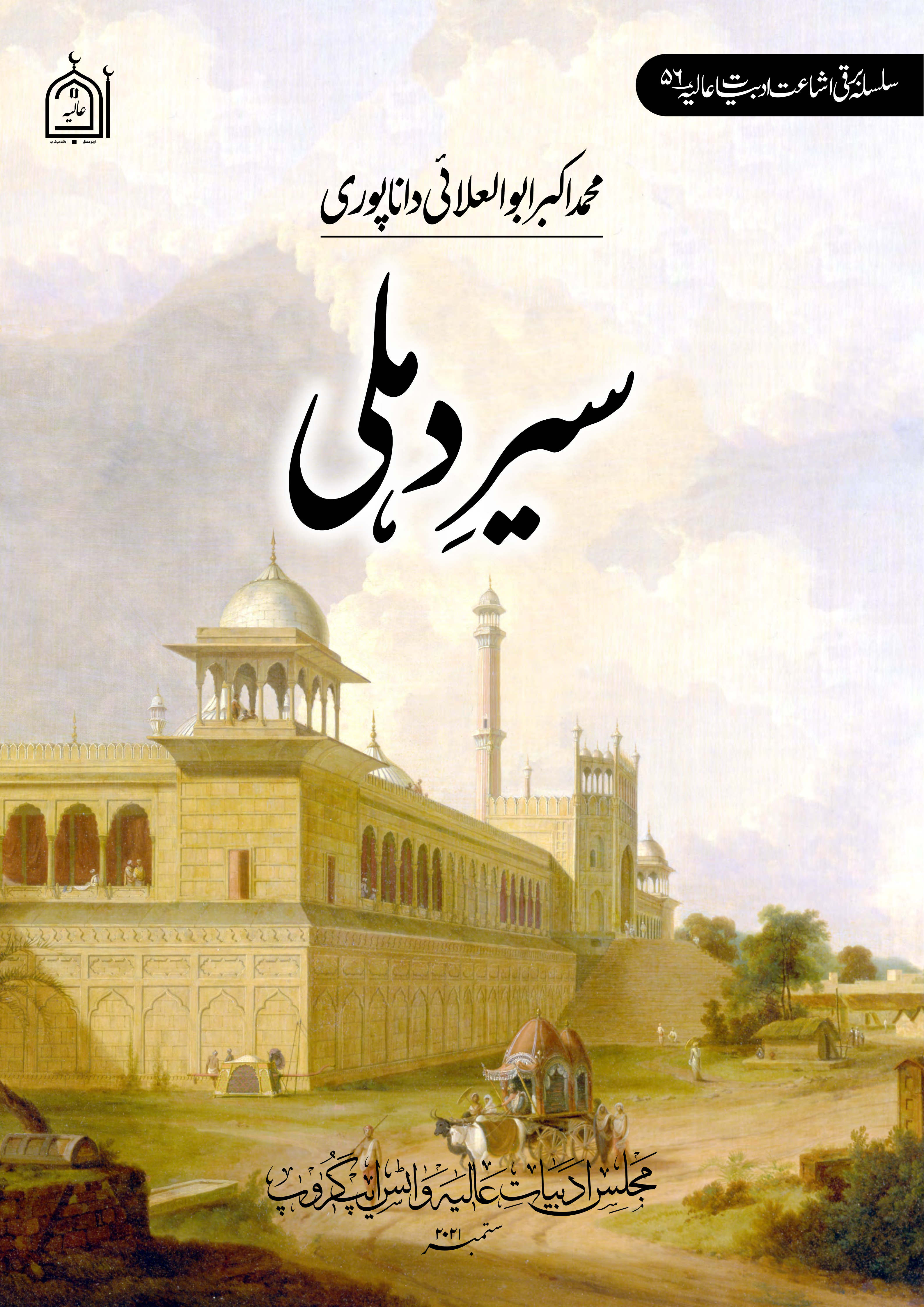


سلسلۂ برقی اشاعت ادبیاتِ عالیہ ۵۶

محمد اکبر ابو العلائی داناپوری

# سیرِ دہلی

مجلسِ ادبیاتِ عالیہ واٹس ایپ گروپ

ستمبر ۲۰۲۱

سلسلہ برقی اشاعت ادبیاتِ عالیہ ۵۶

# سیرِ دہلی

محمد اکبر ابو العلائی داناپوری

ٹائپنگ
مجلس ادبیاتِ عالیہ واٹس ایپ گروپ

سرورق، پروف خوانی و برقی کتاب سازی
Yethrosh

باہتمام
مجلس ادبیاتِ عالیہ واٹس ایپ گروپ
ستمبر ۲۰۲۱

بسم الله الرحمن الرحيم

اللهم إياك نعبد وإياك نستعين والحمد لك يا رب العالمين والرحمن علينا يا أرحم الراحمين والصلوة على رسولك الأمين والسلام على آله الطاهرين وأصحابه المهتدين رضي الله تعالى عنهم أجمعين۔

رباعی ؎

گر در سفرم توئی رفیقِ سفرم    ور در حضرم توئی امینِ حضرم
القصہ بہر کجا کہ باشد گزرم    جز تو نبود ہیچ پناہِ دگرم

امابعد فقیر حقیر خادمِ درویشاں محمد اکبر ابو العلائی داناپوری غفر اللہ ذنوبہ ابن حضرت مرشدی ومولائی حاجی الحرمین الشرفین سید شاہ محمد سجاد ابو العلائی ابن حضرت مولانا سید شاہ تراب الحق ابن حضرت مولانا سید شاہ طیب اللہ نقاب پوش قطبِ وقت ابن حضرت قطب العہد مولانا امین اللہ شہید ابن حضرت مرشدِ آفاق مولانا منور اللہ قدس اللہ اسرارہم ناظرین رسالۂ ہٰذا کی خدمات بابرکات میں التماس کرتا ہے کہ دنیا جیسی بے ثبات ہے سب کو معلوم ہے، حق تو یہ ہے کہ یہاں نفس راست کرنے کی بھی مہلت نہیں ہے۔ لمولفہ ؎

بزمِ ہستی میں ابھی آ کے تو ہم بیٹھے تھے
یوں اجل آئی کہ زانو بھی بدلنے نہ دیا

حضرت رسول کریم سیدنا و مولانا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و اصحابہ وسلم نے ارشاد فرمایاہے: حدیث شریف: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم:ما لى وللدنيا؟ ما أنا والدنيا إلا كراكب استظل

تحت شجرۃ ثم راح وترکہا۔ ترجمہ: حضرت ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ حال ہے دنیا کا میں اور دنیا نہیں ہوں مگر مثل ایک سوار کے کہ کہیں سے وہ تھکا ہوا آیا اور کسی درخت کے سایہ میں اس نے آرام کیا اور اس درخت کو چھوڑ چھاڑ کر چل دیا۔ اللہ اللہ یہ تنگ دنیا حالت دنیا کی اُس زمانہ میں تھی کہ جو زمانہ سراسر سعادت وخیریت کا تھا اور اب تو اس زمانہ سے تیرہ سو برس کا بُعد ہے۔ رباعی ؎

دنیا مطلوبِ طالبِ دین نشود　　شیدائے آن شیفتۂ این نشود
بارِ دلِ عارف نشود جلوۂ دہر　　آئینہ ز عکس کوہ سنگین نشود

اللہ تعالیٰ شانہ نے اپنے کلامِ پاک میں دنیا کی بے ثباتی کی اور اپنے قدرت واختیار کی کیسی خوبصورت مثال بیان فرمائی ہے کہ اس کو پڑھنے اور سمجھنے سے ایک نشہ سا آجاتا ہے اور کیوں نہ آئے جب بادشاہوں کے کلام کو کلام الملوک ملکوک الکلام کہا جاتا ہے تو پھر یہ تو اس کا کلام پاک ہے جس نے بادشاہوں کو پیدا کیا اور ان کو تختِ سلطنت پر بٹھایا۔ الحمد للہ علی احسانہ اور وہ کلام پاک یہ ہے: قال اللہ تبارك وتعالیٰ:إنما مثل الحیوۃ الدنیا كماء أنزلناه من السماء فاختلط به نبات الأرض مما يأكل الناس والأنعام حتى إذا أخذت الأرض زخرفها وازينت وظن أهلها أنهم قادرون عليها أتاها أمرنا ليلا أو نهارا فجعلناها حصيدا كأن لم تغن بالأمس كذلك نفصل الآيات لقوم يتفكرون۔ ترجمہ: یعنی مثال دنیا کی زندگی کے جلد تمام ہو جانے اور جھٹ پٹ امیر سے فقیر ہو جانے میں مثل پانی کے ہے کہ برسایا ہم نے اسے آسمان سے، پھر مل کر نکلا اس پانی سے سبزہ زمین کا جسے آدمی اور چارپائے کھاتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب زمین نے پکڑی رونق اور سنگار پر آئی اور گمان کیا زمین کے مالکوں نے کہ اب وہ اس پر قادر ہیں جو چاہیں سو کریں، پہنچا اس پر ہمارا عذاب خراب کرنے کے واسطے رات کو یا دن کو پھر کر ڈالا اسے کٹے ہوئے کھیت کے مانند۔ گویا کہیں نام ونشان آبادی کا نہ تھا کل۔ اِسی طرح سے ہم بیان کرتے ہیں مثالوں سے دلیلیں اپنی قدرت کی ان لوگوں کے لیے جو سوچتے ہیں اور ان میں نفع اٹھاتے ہیں، انتہیٰ۔ یہی حالت بجنسہ اس دنیا کی ہے جسے کائناتِ انسانی کہتے ہیں یعنی بچہ پیدا ہوا اور اس کے نرم نرم ہاتھ پاؤں اور بھولی بھولی صورت کیسی پیاری معلوم ہوتی

ہے کہ ایک دم آنکھوں سے جدا کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ جب ماں باپ نے اس کو پالا، پرورش کیا اور وہ بچہ بڑا ہوا اور اپنے پاؤں سے پھرنے لگا اور توتلی زبان سے میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگا تو وہ ماں باپ اور کنبے کے لوگ اسے دیکھ دیکھ کے خوش ہونے لگے۔ یہاں تک کہ وہی لڑکا جوان اور قوی و توانا ہوا۔ کوئی اس میں سے ولی ہوا، کوئی عالم ہوا، کوئی بادشاہ ہوا، کوئی حکیم ہوا، کوئی ہنر مند ہوا، کوئی شاعر ہوا اور تھوڑے زمانے کے بعد سب فنا ہوگئے۔ اگر ولی صاحب ارشاد ہوا تو اس کا سلسلہ ہمیشہ کے واسطے قائم رہا اور اگر عالم صاحبِ تصنیف ہوا تو اس نے اپنی زندگیِ دوام کا بندوبست کر لیا اور اگر بادشاہ باانصاف ہوا تو نوشیرواں کی طرح عمر ابد حاصل کر لی اور حکیم اگر درس دے گیا تو افلاطون کی طرح باوجود خم نشینی نام اُس کا سر دفتر فہرستِ کائنات رہا؛ وقِس علی ہذا۔ واِلّا بے نام ونشان ہو گئے، یہ بھی نہیں معلوم ہوا کہ کوئی شخص کبھی اس دنیا میں آیا بھی تھا۔ پس جب یہ دنیا ایسی بے ثبات ہے تو اس سے تعلق ہی نہ پیدا کرے اور اس کا تماشا دیدۂ عبرت بیں سے کرے اور اس عالم کو سیر گاہ سمجھے اور اس کی سیاحت کرے اور اس کی برکتوں سے روحانی نفع اٹھائے اور جب تک ہاتھ پاؤں میں قوت ہے دنیا کو چل پھر کر دیکھے اور جب قواے ظاہری جواب دینے لگیں پھر گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر روحانی منزلیں طے کرنے لگے۔ لمولفہ

سالک وہ ہے ہمیشہ ہے جس کو مسافرت
آبِ رواں ہے پاک یہ برکت سفر کی ہے

سالکِ طریقت کے لیے بحکم محکم "سیروا في الأرض" سفر دوام ضرور ہے اور اس دنیا سے سبقِ عبرت حاصل کر سکتا ہو جو اسے غور و تامل کی نگاہوں سے دیکھے گا۔ جس شخص کی سیاحت جتنی وسیع ہوگی، اس کی معلومات و تحقیقات بھی ویسی ہی عریض وطویل ہوگی۔

تا بدوکانِ خانہ در گروی　　　ہرگز اے خام آدمی نشوی

اہلِ طریقت کے لیے بڑا فائدہ سفر کا ایک یہ ہے کہ ان کا دل کسی جگہ سے تعلقِ خاص پیدا نہیں کرتا۔ روزانہ کے سفر سے دنیا واقعی طور سے ان کو سراے فانی معلوم ہونے لگتی ہے۔ لمولفہ

مسافر اُس میں ہیں اوترے ہوئے اِس میں ہے تو منعم
یہی حالت سرا کی ہے جو اس دولت سرا کی ہے

وطن کی محبت ایک سخت محبت ہے۔ انتہا یہ ہے کہ حضرت یوسف علی نبینا وعلیہ السلام سے نبی کو باوجودیکہ مدت ہائے دراز تک عزیزِ مصر رہے مگر وطن کی یاد نہ بھولی۔

یوسف کہ بمصر بادشاہی می کرد
می گفت: گدا بودنِ کنعان خوشتر

اگرچہ کہ اس قول کی تاویل یہ ہو سکتی ہے کہ ان کو وطن کی ضمنی محبت تھی، اصل محبت ان کو اپنے والدِ بزرگوار کی تھی ورنہ برادرانِ وطن کا حسنِ سلوک تو معلوم ہی ہے۔

بھاگ اِن بردہ فروشوں سے کہاں کے بھائی
بیچ ہی ڈالیں جو یوسف سا برادر ہوئے

پس سالک کے لیے سفر اس اصول سے قرار پایا ہے کہ کہیں وطن اور عزیزانِ وطن کی محبت کا شجر اس قدر نہ پھیلے کہ محبوبِ حقیقی کی محبت کا تخم جس کے سایہ میں دب کر رہ جائے۔ ایسے ہی مقام پر قول "السفر وسیلة الظفر" درست آتا ہے، وگرنہ سفر کے مصائب مخفی نہیں ہیں۔ مسافرانِ دنیا دار سے پوچھ لیجیے، انھیں لوگوں کے واسطے حضرت نے ارشاد فرمایا ہے: السفر قطعة من السقر۔ اور اہلِ سلوک کے ہاں فائدہ سفر کا یہ ہے کہ نفس مودب ہو جاتا ہے، اخلاق پاکیزہ ہو جاتے ہیں، آدابِ حاضری خدمتِ فقرا و صحبتِ امرا آجاتے ہیں، نشۂ غرور و نخوت سر سے نکل جاتا ہے، مسافرت میں اِدھر سے ادھر مارے پھرتے ہیں، کوئی پوچھنے والا نہیں۔ وطن میں جو پہچاننے والے لوگ فی الجملہ عزت کرتے تھے اور اس نے ایک سرمایۂ پندار دماغ میں جمع کر رکھا تھا، مسافرت میں اس کا تزکیہ ہو جاتا ہے۔ وطن میں امرا قدم چومتے تھے، غربت میں

سالک کو امرا کے خدام کے پاؤں چومنے کی نوبت آجاتی ہے۔ پاک اور بڑی عظمت و شان والا وہ اللہ ہے کہ جس نے اپنے کسی بندے کا دل ایسے پاک خیالوں سے بھر دیا ہے۔

اُفتادگی بر آورد از خاک دانہ را
گردن کشی بخاک نشاند نشانہ را

آدمی وہی ہے جو خاکسار ہے، کیونکہ یہ اپنی اصل کی طرف پھرتا ہے اور ہر آدمی کا جوہر ذاتی یہ ہے کہ اپنی اصالت کو نہ بھولے۔ مثل: اے ایاز! قدر خود بشناس۔ اور یہ باتیں آدمی کو سفر ہی کے تجربے سکھاتے ہیں۔ الغرض سفر کی برکتیں بے شمار ہیں جن کا اندازہ مشکل ہی سے ہو سکتا ہے۔ یورپ میں اگر پاک اور حلال کھانا ملتا تو واقعی وہ خطہ سیر کے قابل ہے لیکن اگر کوئی شخص کسی وجہ سے مسافرت کے قابل نہ ہو تو وہ اپنی ذات ہی میں سفر کیا کرے اور گھر بیٹھے آیاتِ قدرت کا تماشا کر تا رہے۔ لمولفہ

ہمارے جسم میں ہے ایک عالم اور ہم غافل　　نہیں معلوم اس میں کر رہی ہے کام قدرت کیا
جانے نہ پائے شاہدِ معنٰی کی جستجو　　اکبرؔ نفس کی طرح وطن میں سفر رہے

اگرچہ میں نے اس بلدۂ متبر کہ کی چند بار زیارت کی ہے مگر ہر بار اس کی سیر نے نیا ہی لطف دکھایا ہے۔ اور نیا لطف کیوں نہ آئے، دہلی بائیس خواجہ کی چوکھٹ ہے، یہ اولیاء اللہ کا آستانہ، یہ علما کا مدرسہ، یہ شعرا کا مشعرہ، یہ بادشاہوں کا دار السلطنت، یہ حکما کا مطب، یہ تجارت کی منڈی، یہ اہل صنعت کی کارگاہ۔ بمبئی اور کلکتہ کو یہ جمعیت کہاں نصیب، کلکتہ آدمیوں کا جنگل ضرور ہے مگر سب عاریتی یعنی پردیسی اور اس پر بھی اس تراش خراش کے انسان اسے کہاں نصیب۔ بمبئی بہت وسیع شہر ہے، آٹھ آٹھ اور نو نو منزل کی عمارتیں ہیں مگر ایسی جیسے کبوتر کی کابکیں اور آدمی کل جنگلی۔ دہلی کی قطع کے وسیع و فراخ مکانات بمبئی کو خواب میں بھی نظر نہ آئے ہوں گے۔ ہائے دہلی، وائے دہلی! لیکن حق تو یہ ہے کہ اس کے بگڑے زمین بھی لطف ہے۔

نہ کچھ پیری چلی بادِ صبا کی　　بگڑنے میں بھی زلف اس کی بنا کی

میں نے دہلی کا ایک شہر آشوب لکھا ہے، اُس کا اس مقام پر درج کرنا خالی از لطف نہ ہو گا۔

## قطعۂ شہر آشوبِ دہلی

او فلک، او ستم ایجاد، جفا جو ظالم
کینہ کش تفرقہ انداز کمینہ پرور
تیری چالوں کے ہیں انداز جدا، ڈھنگ نئے
کج روی ہے جو بلا کی تو غضب کی ٹھوکر
تیری گردش سے زمانہ بھی ہے غلطاں پیچاں
اُسے بھی ہاتھوں سے تیرے نہیں دنیا میں مفر
وہ شہنشاہ لرزتا ہے زمانہ جن سے
تیری چالوں سے مگر کانپ رہے ہیں تھرتھر
پالسی ایسی کہ اب تک نہیں سمجھا کوئی
تو نے کی صلح بھی جس سے نکل آیا کوئی شر
انھیں کو خاک میں چُن چُن کے ملایا تو نے
آپ پہنائے تھے خلعت میں جنھیں تاج و کمر
بادشاہوں کو بھی آرام سے رہنے نہ دیا
یہ پریشاں ہے تو دل سینہ میں اُس کا مضطر
نیند آتی نہیں سونے کے چھپر کھٹ میں بھی
سلطنت کا اِسے دھڑکا تو اُسے جان کا ڈر
ایک کے سر پر اگر قہر کا آرہ رکّھا
حلق پر دوسرے کے ظلم کا ریتا خنجر
بم کے گولے سے اگر اس کو اُڑا کر مارا
اس کی شریانوں میں اک تیز چبایا نشتر
گیدڑوں نے کیا یورپ کے سیہ شیر کو قید
کیا اولٹ پھیر ہے، سمجھے اسے کس طرح بشر
ملک کی بھی وہی حالت ہے جو شاہوں کی ہے
کیسا آباد تھا جو شہر وہ ہے آج کھنڈر
وہ عمارت کہ جو کرتی تھی فلک سے باتیں
مٹ مٹا کر ہوئی اب تحت ثریٰ کی ہم سر
وہ مکان قصرِ جنان کی جو دکھاتا تھا بہار
اب نہ چھت ہے کہیں اُس میں نہ جھروکے ہیں نہ در
کر نہ سکتی تھی جہاں چشم سخن گو ایما
اب وہاں شورِ اراذل سے ہے سر میں چکر
خندۂ زیر لبی کی نہ جہاں جرات تھی
اب وہاں رہتی ہے دیوانوں کی سی بڑ دن بھر
وہ مکان آنکھیں بچھاتے تھے جہاں رجواڑے
اب وہاں جھاڑو بھی دینے نہیں آتا مہتر
وہ مکان تھا جو سلاطین کے شورے کا مقام
وہیں اوباشوں کا اب رہتا ہے مجمع اکثر

وہ مکان جس کی چھتوں میں تھے طلا کار نقوش
اب اوسی قصر میں اِدبار نے چھایا چھپّر

وہ مکان جو صلحا کا تھا عبادت خانہ
مے گلرنگ کے چلتے ہیں وہیں اب ساغر

وہ مکان جس کا تھا ہر ایک ستون اک راجا
ہائے کیا ہو گیا وہ گھر، وہ عمائد ہیں کدھر

خاص دربار جو ہے ایک مکان با شوکت
دوڑتے پھرتے ہیں دیواروں پر اُس کی بندر

جس جگہ دور سے ہوتا تھا سلام اور مجرا
وہ مقام اب کس و ناکس کی بنا راہ گذر

جس جگہ ایک زمانہ میں تھا تخت طاؤس
اب وہاں بیٹ ہے کووں کی، ابابیل کے پر

جس جگہ سر کو قدم کر کے بھی جانا تھا محال
جوتے پہنے ہوئے پھرتے ہیں وہاں برہنہ سر

جس جگہ اطلس و دیباج کی مسند تھی بچھی
ٹاٹ کا فرش بھی اب واں نہیں آتا ہے نظر

جس جگہ موتیوں کا پاتے تھے خلعت راجا
اب منوں ہیں اوسی دربار میں پتھر کنکر

شمعِ کافوری کے روشن تھے جہاں بیسوں جھاڑ
اب وہاں آہِ جگر سوز کے اوڑتے ہیں شرر

وہ مکان شیش محل نام ہے جس کا مشہور
اُس کی دیواروں پر اب خاک کا دیکھا استر

وہ ہی گھر آج نمونہ ہے بنا دوزخ کا
جہاں آتی تھی ہوا باغ جناں کی فرفر

آج انگریزوں کے اس گھر میں ہیں چولھے جلتے
جس میں کل عود قماری کی تھی روشن مجمر

موتی مسجد کی صفا اور وہ خوبی اُس کی
دیکھ لے اُس کو تو پڑھنے لگے کلمہ کافر

یوں ہیں ویران پڑی ہے نہ اذان ہے نہ نماز
خشک ہے حوض وضو کا تو شکستہ منبر

سب مکانوں کو شرف اپنے مکینوں سے ہے
اٹھ گیا صاحبِ خانہ تو ہے ویران وہ گھر

مرثیہ ایک جداگانہ ہے بازاروں کا
جس کے سننے سے ہو پانی ابھی پتھر کا جگر

چاندنی چوک میں تھا شانہ سے شانہ چھلتا
تھالی پھینکو تو سروں ہیں پہ رہے سر تا سر

چاوڑی میں نظر آتا تھا ہر اک ملک کا مال
ہفت اقلیم کے موجود تھے واں سوداگر

ایسے صناعِ سبک دست وہاں تھے موجود
جن سے شرمندہ ہو یورپ کا ہر اک اہلِ ہنر

عصر کے وقت سے ہوتی تھی وہ بازار میں بھیڑ ... آج بھی جس کے تصور سے ہے دل زیر و زبر
چوبداروں کی وہ للکار، نقیبوں کی صدا ... شاہزادوں کا نکلنا وہ ہوا داروں پر
نوجوانوں کا وہ گھوڑوں کو جمانا سرِ راہ ... اور گھوڑوں کا جھمکنا وہ پہن کر زیور
وہ کٹوروں کی صدا اور وہ جھنکار اُن کی ... پانی میں ایسی حلاوت کہ خجل ہو کوثر
برف والوں کی صدا سن کے جگر ٹھنڈا ہو ... قفلیاں دیکھ ہی لینے سے کلیجا رہے تر
چٹ پٹا پن وہ کبابوں کا، کچالو کی بہار ... اور کھانا اوسے یاروں کا مزے لے لے کر
جمگھٹے آنکھوں میں احباب کے پھر جاتے ہیں ... یاد آجاتی ہے جس وقت ہمیں عید کی ٹر
پھول والوں کی وہ سیر اور وہ شستہ میلہ ... اُس کی شفافی کے آگے کہیں میلا ہے چھتر(۱)
سیر اَمریوں کی اور شاہ کا واں خود آنا ... لطف برسات کا وہ پانی کا بہنا شر شر
خاص بازار میں رونق تھی، دریبہ شاداب ... دہلی آباد تھی جب تک رہے دہلی میں ظفرؔ
دہلی والوں ہیں کے دل سے کوئی اس کو پوچھے ... لٹی کس طرح، بپا کیسا ہوا واں محشر
وہ حسین بیبیاں مریم کی صفت تھی جن میں ... مر گئیں خوف سے عزت کے کنوؤں میں گر کر
لڑکیاں کھوئی گئیں جو وہ ابھی تک نہ ملیں ... گریۂ نیم شبی سے ہوئی اندھی مادر
بھائی سے بھائی جو بچھڑا تھا وہ بچھڑا ہی رہا ... بعض احباب کی اب تک نہیں کچھ ہم کو خبر
زخم سے چور ہے دم توڑ رہا ہے فرزند ... ہو گیا باپ دوتا جھک گئی صدمے سے کمر
نوجوانوں کو ہوئیں پھانسیاں بے جرم و قصور ... مار دیں گولیاں پایا جسے کچھ زور آور
وہی صہبائیؔ جو تھے صاحب قول فیصل ... ایک ہی ساتھ ہوئے قتل پدر اور پسر
شہر سے بے سر و پا نکلی جو خلقت اک بار ... بس زن و مرد نظر آتے تھے نیچے اوپر

---

۱۔ چھتر ایک ہندوؤں کا میلا ہے۔ داناپور گنگا ندی کے اس پار ہوتا ہے جس میں ہزار ہا گھوڑے، ہاتھی اور ہر قسم کا قیمتی مال بکتا ہے۔ ہندوستان ک مشہور میلا ہے۔

اکبر آباد چلا یہ تو وہ جے پور کی طرف
حیدر آباد کوئی، کوئی سدھارا الور

صبح سے شام تلک ہو گیا خالی سب شہر
گھس پڑی لوٹنے کو فوج گھروں کے اندر

گوروں نے شاہ کو ہر ایک طرف سے گھیرا
اور پہنا دیا اک گیروا موٹا بستر

پھر دکھائی گئیں شہزادوں کے سر کی نذریں
بولے مقبول ہوئی الفتِ آلِ حیدر

بعد اس کے ہوا رنگون کی جانب کو کوچ
قلعہ تاریک ہوا، بجھ گئی شمعِ اکبر

لکھنؤ کی بھی اسی طرح ہوئی بربادی
لکھنؤ جسم تھا، اس جسم کی جان تھا اختر

لکھنؤ چھوڑا تو آباد کیا مٹیا برج
اسی منزل میں رہا تھوڑے دنوں دورِ قمر

سارے کلکتہ پر اس خاک کے ٹکڑے کو تھا فضل
اس میں کیا پانی برستا تھا، برستے تھے گہر

سیکڑوں خانہ بدوشوں نے یہاں گھر پایا
خوانِ نعمت کا بٹا کرتا تھا ہر دم لنگر

کوئی محتاج یہاں پر اگر آجاتا تھا
ملتے تھے مٹھیاں بھر بھر کر اوسے سکۂ زر

یوں تو ہوتا ہے ہر اک شاہ خدا کا سایہ
شاہِ مظلوم حقیقت میں تھا ظلِ داور

عہد میں اپنے کسی کو نہ دیا قتل کا حکم
کسی مجرم پہ نہ ڈالی کبھی غصہ کی نظر

کیسی آباد تھی اُس شاہ کے دم سے یہ زمین
وہ تہِ خاک ہوا، اوڑنے لگے خاک اِدھر

وہ زمین خلد کو ہم کہتے تھے فوٹو جس کا
خوش سواد آج ہے اس سے کہیں بڑھ کر بنجر

باغِ شاہی ہے کہ ہے یہ کوئی ماتم خانہ
بلبلیں نوحہ سرا، غنچہ و گل خاک بسر

ہے روش باغ کی یا مانگ کسی بیوہ کی
حوض پانی سے لبالب ہے کہ ہے دیدۂ تر

یہ رگڑتے نہیں آپس میں ہوا سے پتے
مَل رہے ہیں کفِ افسوس گلستان کے شجر

قمریاں بیٹھی ہوئی کرتی ہیں کو کو سرِ سرو
ہائے کیا ہو گیا وہ لکھنؤ کا اسکندر

یہ درختوں پہ بسیرا نہیں لیتے طائر
پڑھتے ہیں نوحۂ سلطانِ اودھ شام و سحر

ہاتھ ملتی ہے مگس مطبخ سلطانی کی
اب شکر خوروں کو پہنچے گی کہاں سے شکر

رزق جن کا ہوا بند، اون کی کہوں کیا حالت — ہاتھ کو سر پہ دھرے بیٹھے ہوئے ہیں ششدر
روتے پھرتے ہیں گلی کوچوں میں سب پنشن خوار — دیکھیے کٹتا ہے اب ان کا بڑھاپا کیوں کر
بیگموں کا وہ تڑپنا، وہ خواصوں کا بیان — وہ یتیموں کے بلکنے کا جگر سوز اثر
یہ قیامت تھی کہ بس ایک جگہ تھے زن و مرد — اور ناموس کو بھی پہنچا کسی کے نہ ضرر
آن کی آن میں کچھ اور ہی حالت دیکھی — نہ وہ سلطان نظر آیا نہ وہ اوس کا لشکر
وہ جو خس خانہ میں آرام کیا کرتا تھا — آج ہے قبر میں اور قبر پہ ہے اک چادر
آج اوسی مچھی بھون کی ہے ہوا آتش بار — جس میں چلتی تھی نسیم سحری کل سر سر
کوٹھیاں خالی ہوئی جاتی ہیں، سب گھر ویران — سروں پر گٹھریاں گاڑی پہ لدے ہیں گھٹھر
اس نے کلکتہ میں بسنے کا ارادہ ٹھانا — لکھنؤ جانے کو ہے اس نے لپیٹا بستر
غول کا غول چلا جاتا ہے مغرب کی طرف — اور دس بیس نے مشرق کا کیا عزمِ سفر
قافلہ ایک نجف جاتا با نالہ و آہ — کچھ مدینے کو چلے ساتھ لیا اک رہبر
کربلا جانے کو اب ہوتا ہے تیار کوئی — کوئی مشہد کے لیے نکلا ہے گھر سے باہر
دم کی دم میں ہوئی تاراج یہ ساری بستی — دیکھتے دیکھتے سب ہو گئے تِتّر بِتّر
سایہ کیا شاہ کا سر پر سے رعیت کے اوٹھا — بھاگتے پھرتے ہیں سب جیسے سپہ بے افسر
جب نہ ہو شاہ تو ویران نہ ہو اکبرؔ کیوں ملک — گنجفے میں بھی ہے بے شاہ کی بازی ابتر

باز آمدم بر سر مطلب، المختصر اس سفر کی تحریک مجھے برادر عزیز سراپا سعادت مولوی محمد حمید اللہ خاں مد اللہ عمرہ کی شادی نے کی۔ رقعہ پہنچا اور میں چل نکلا۔ داناپور کے اسٹیشن پر جو پہنچا تو یہاں پر ماگھ کے میلے کا وہ ہجوم تھا کہ العیاذ باللہ، گاڑی میں بیٹھنا تو کیسا کھڑے ہونے کو جگہ نہ تھی۔ منجھولے درجہ کے ٹکٹ کا جادو وہاں کیا چلتا، اول اور دوسرے درجہ والوں کی عافیت تنگ تھی لیکن یہ حضرت چمیلی کے ترو تازہ شگفتہ پھول یعنی سکہ ہائے رائج الوقت وہ بلا کے چلتے پرزے ہیں کہ نہ پوچھیے، ملازمان ریلوے کی جیب گرمی کر دی

پھر تو جگہ ہی جگہ تھی۔ الغرض ہم الہ آباد پہنچے اور وہ بھیڑ وہیں رہ گئی اور ملازمان ریلوے کے ناز و غمزے سے بے نیاز ہو گئے۔ اب تو ہم نے رضائی تان اور دراز ہو گئے۔ اور گاڑیوں کا تو حال ہمیں کیا معلوم مگر ہماری گاڑی تو خلوتِ معشوق ہو گئی، کسی غیر کا اندیشہ تک نہ رہا۔

الحمدللہ علی احسانہ کہ ۱۳/ رجب المرجب ۱۳۱۱ھ بروز پنج شنبہ پانچ بجے دن کو دہلی کے اسٹیشن پر ہماری گاڑی پہنچ گئی۔ گاڑی کرایہ کی اور فیض بازار جناب مولوی محمد سمیع اللہ خاں صاحب بہادر کے مکان پر پہنچے۔ مولوی صاحب سوار ہو گئے تھے، ایک گھنٹے کے بعد واپس تشریف لائے، ہرچند مجھے پندرہ برس بعد دیکھا تھا مگر فوراً پہچان لیا۔ مجھے بھی پہچاننے میں کچھ دقت نہ ہوئی۔ میں نے مولوی صاحب کے اخلاق و عادات میں سر مو فرق نہ پایا، نماز کے اوقات ویسے ہی ہیں بلکہ مذہبی خیالات پہلے سے بہت زیادہ۔ حیرت انگیز امر یہ ہے کہ کتب درسیہ کا استحضار علی حالہ ہے۔ جناب مولوی صاحب کی عظمت میرے دل میں یوں ہے کہ فقہ اور حدیث اور تفسیر میں پورا تبحر حاصل ہے اور ابھی تک اکثر کتابیں یاد ہیں اور تقوی کا اثر تو بشرے سے ظاہر ہے، سیماھم فی وجوھھم من أثر السجود۔ جناب مولوی صاحب نے مجھے اپنے ہی کمرے میں جگہ دی۔ شاہ امین الدین قیصر سے بھی یہاں ملاقات ہوئی، وہ بھی الہ آباد سے اسی شادی کی تقریب میں آئے ہوئے ہیں، ان کو دیکھ کر بہت دل خوش ہوا۔ مہمانوں کی آمد شروع ہے، ساعت بہ ساعت ازدحام بڑھتا جاتا ہے۔ مہمانوں کا تار بندھا ہوا ہے۔ اچھے اچھے لوگ نظر آتے ہیں، خوبصورت مجمع ہے۔ کئی بڑے بڑے مکان مہمانوں کے واسطے آراستہ و پیراستہ ہیں۔ اگرچہ ہم امرا سے بہت کم ملتے ہیں، لیکن اس بارات کی سیر اور امرا کے اخلاق کا ملاحظہ مقصود ہے۔ اب ہم اور شاہ امین الدین قیصر اسی مکان میں جو نواب پاٹودی کے نام سے مشہور ہے، جاتے ہیں۔ وہاں ایک دالان اور ایک کوٹھری ضرورت کی چیزوں سے آراستہ ہے اور ہم اُس کو دیکھ کر پسند کر آئے ہیں۔ یہ مکان نہایت وسیع ہے، اس کا کمرہ کمرہ اور دالان دالان آراستہ و پیراستہ ہے۔ پھاٹک کے سامنے ایک دو منزلہ رفیع الشان کوٹھی ہے جو انگریزی اور ہندوستانی قطع سے ملی جلی ہے۔ اس میں متعدد کمرے ہیں اور اس کوٹھی کے یمین و یسار چند محل سرائیں ہیں، وہ سب ہندوستانی شاہی قطع کی خوبصورت

عمارتیں ہیں۔ ایک محل سرا کو طے کیجیے اور اس کے آگے ویسی ہی دوسری موجود ہے، دوسری کو طے کیجیے اس کا جواب تیسری محل سرا موجود، بلکہ پہلی دوسری سے زیادہ دلچسپ اور سب میں کل ضرورتوں کے مکان و اسباب موجود۔ کسی مکان کی قطع سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ جاڑوں کے لیے بنایا گیا ہے اور کوئی خاص گرمیوں کے موسم کے واسطے تعمیر کیا گیا ہے اور کوئی ایام برشکال کے واسطے معلوم ہوتا ہے۔ میں ان مکانوں کو نہایت حسرت کی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اور ان کے بنانے والوں کی حالت موجودہ پر افسوس کر رہا تھا کہ ایک بوڑھے آدمی جو دہلی کے رہنے والے ہیں، مجھ سے کہنے لگے کہ یہ مکان تو یہاں متوسط درجے کا ہے۔ عمدہ مکان تو اس شہر کے اُس حصہ میں تھے جو کھد گیا۔ واقعی دہلی عجیب جگہ ہے، شاہی عمارتیں جس کثرت سے اکبر آباد یا دہلی میں ہیں اور کسی شہر میں نہیں، مگر آدمی دہلی سے اکبر آباد کے زیادہ خلیق ہیں۔ اب ہم اپنے دالان میں آکر بیٹھے ہیں اور دو خدمت گار دہلی کے باشندے ہمارے سامنے دست بستہ حاضر ہیں، نیک بخت اور مؤدب معلوم ہوتے ہیں۔ اسی طرح سے دو دو خدمت گار مولوی صاحب کی طرف سے ہر مہمان کے واسطے مقرر ہیں۔ ہم نے اپنے مکان میں صاف ستھرا فرش بچھا پایا اور دو نواڑ کی پلنگڑیاں توشک اور تکیوں سمیت بچھی پائیں۔ دیواری اور فرشی لیمپ خوب صورت روشن ہیں اور کوٹھی کے صحن میں متعدد خیمے کھڑے ہیں۔ ان خیموں اور مکانوں کے واسطے فروش وغیرہ خواجہ محمد یوسف صاحب اور خواجہ محمد اسماعیل صاحب نے علی گڑھ سے بھیجے ہیں۔ یہ دونوں صاحب اس برات کے منتظم ہیں، ہر خیمے میں اِس قدر روشنی ہے کہ جگمگا رہا ہے، ابھی بہت مہمان نہیں آئے ہیں۔ آتے جاتے ہیں اور بہت سے مہمان جو انگریزی وضع ہیں وہ محلہ دریا گنج کی کوٹھی نمبر ۴ میں فروکش ہیں، ان کے واسطے ویسا ہی سامان کیا گیا ہے اور وہ کوٹھی بھی بالکل بھری ہوئی ہے۔

اب عشا کا وقت ہے۔ ہم دونوں آدمی اپنی فرود گاہ کی طرف پلٹتے ہیں۔ ہمارے دالان میں نہایت خوب صورت نقش و نگار کے سرخ بمبئی پردے پڑے ہیں اور دونوں خدمت گار مؤدب دوزانو دالان میں بیٹھے ہیں۔ ہم کو دیکھ کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ہم نے جانماز بچھائی اور خدمت گار فوراً باورچی خانے کو روانہ ہو

گئے اور بات کی بات میں خاصے کے خوان لے آئے۔ چونکہ میں عشا کے بعد بہت دیر تک سورہ مزمل شریف اور وظیفہ پڑھتا ہوں، وہ خاصہ جو آیا تھا ٹھنڈا ہو گیا۔ اِدھر میں نے وظیفہ تمام کیا اور اُن شایستہ خدمت گاروں نے جھٹ پٹ دوسرا گرم خاصہ لا کر حاضر کیا اور وہ خاصہ باورچی خانہ میں واپس کر دیا۔ ہم نے کھانا کھایا اور استراحت کی۔ ان خدمت گاروں میں سے ایک شخص جس کا نام امیر بیگ ہے وہ تہجد گزار بھی ہے الحمد للہ علی نعمائہ۔ صبح ہو گئی، نماز کے واسطے جو اٹھے تو گرم پانی وضو کے لیے تیار پایا۔ نماز سے فرصت کی، وظیفہ تمام ہوا، اشراق پڑھی، اب کسل سفر کا کچھ اثر باقی نہیں ہے۔

آج ۴/ رجب روزِ جمعہ ۱۳۱۱ھ ہے۔ ہم دونوں آدمی جناب شمس العلما منشی محمد ذکاء اللہ خاں بہادر کی ملاقات کو جاتے ہیں، مجھ سے اور منشی صاحب سے دیرینہ رابطہ ہے، اس مکان سے منشی صاحب کا مکان بہت قریب ہے۔ منشی صاحب ہم کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور فوراً اپنی قدیمی عادت کے موافق منیر خاں خدمت گار کو چاے کا حکم دیا، وہ نیک بخت خدمت گار بات کی بات میں چاے تیار کر کے لایا اور ایک دوسرے خوان میں چند تشتریاں حلوا اور میوہ جات اور دال موٹ وغیرہ کی رکھ کر لایا اور ہمارے سامنے رکھ دیں۔ بھلا دو آدمی کس قدر کھا سکتے تھے، دو دو پیالیاں چاے کی پیں اور کچھ تنقل کیا اور اسی نیک بخت منیر خاں کو ہمراہ لیا اور حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ کو روانہ ہوئے۔ راستے میں چتلی قبر ملی، یہاں بھی فاتحہ پڑھا اور ساعت چند توقف کیا، لیکن قلب کو اس طرف ربط نہ پیدا ہوا۔ یہاں سے قریب حضرت مرزا صاحب کی خانقاہ ہے، دروازے پر جو پہنچے تو اسے بند پایا۔ ہر چند کوشش کی مگر دروازہ نہ کھلا، معلوم ہوا کہ اب اس خانقاہ کی مجاورت جن کے متعلق ہے ان کا نام ابو الخیر ہے، مزاج ان کا جادۂ اعتدال سے گذرا ہوا ہے، نمازیوں کو بھی مسجد میں نہیں آنے دیتے۔ ہم نے دروازے ہی پر سے فاتحہ پڑھ لی۔ حضرت مرزا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی لوحِ تربت پر یہ شعر کندہ ہے؎

بلوحِ تربتِ من یافتند از غیب تحریرے
کہ ایں مقتول را جز بے گناہی نیست تقصیرے

آپ کی تاریخِ وصال ۱۱۹۵ھ ہجری اس مصرع سے نکلتی ہے ؎

عاش حمیداً مات شہیداً

۱۱۹۵ھ

روایت یوں بیان کرتے ہیں کہ حضرت مرزا صاحب نے جناب حضرت امام حسین علیہ السلام کو خواب میں دیکھا کہ آپ فرماتے ہیں کہ تم میرے پاس چلے آؤ۔ آپ صبح کو جب بیدار ہوئے تو قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ سے یہ خواب بیان کیا اور خود ہی ارشاد کیا کہ تعبیر اس خواب کی شہادت ہے اور اس کا کوئی سامان نہیں ہے۔ چند ماہ کے بعد شبِ عاشورۂ محرم شریف کو نجف خاں کے دو غلام حبشی سہراب اور ہمدانی آدھی رات کو خانقاہ میں گھس آئے۔ اُس وقت آپ پر ایک حالت رفیع طاری تھی، آپ مسجد کے صحن میں ٹہل رہے تھے۔ سہراب نے آپ سے پوچھا کہ در حق معاویہ چہ می گوئی؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ من در حقِ خلف ہیچ نمی گویم چہ جائے کہ سلف۔ بس اس نے قرابین کا فیر آپ پر کیا، آپ مجروح ہو کر گر پڑے اور وہ لوگ بھاگ گئے۔ خانقاہ کے لوگوں کو خبر ہوئی، انھوں نے آکر آپ کو اٹھایا۔ آپ ہر بار کروٹ بدلتے تھے اور یہ شعر پڑھتے تھے ؂

بپا کردند خوش رسمے بخون و خاک غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

آپ کے مزار مبارک کے پہلو میں پورب کی طرف جناب حضرت شاہ غلام علی قدس سرہ آپ کے خلیفہ آسودہ ہیں ان کی تاریخ وفات یہ ہے۔ قطعہ ؂

چون جنابِ شاہِ عبد اللہ قیومِ زمان　　زین جہان فرمود رحلت سوے درگاہ کریم
سالِ او با حال خوبش جستم ای راحت زدل　　گفت ”فی روح و ریحان و جنات النعیم“

۱۲۴۰ھ

اور آپ کے پہلو میں حضرت ابو سعید آپ کے خلیفہ کا مزار ہے، ان کے لوح مرقد پر یہ تاریخ کندہ۔ قطعہ ؂

امام و مرشدِ ما شاہِ بو سعیدِ سعید　　بروزِ عید چو شد داخل جنابِ خدا
دلِ شکستۂ مغموم گفت تاریخش　　ستونِ محکم دینِ نبی فتاد زپا

۱۲۵۰ھ

اور چوتھی قبر حضرت مولوی رحیم بخش سجادہ خانقاہ مرزا صاحب کی ہے۔ اس قبر پر یہ تاریخ ہے، قطعہ ؎

بروزِ شنبہ دہم از جمادیِ ثانی گذشت حضرتِ عبد الرحیم حق آگاہ

بسالِ رحلتِ آن نیک خو ولیِ خدا قلم نوشت کہ الان اولیاء اللہ

اس تاریخ کے نیچے ۱۲۸۳ھ لکھے ہیں، مگر کسی مصرع سے یہ عدد نہیں نکلتے واللہ اعلم بالصواب۔ ہر چند دروازہ خانقاہ نہ کھلا مگر فیض ارواح طیبات کے لیے در و دیوار حجاب نہیں ہو سکتے اور اس کے سوا ہم پہلے بھی حاضر ہو چکے ہیں۔

در راہِ عشق مرحلۂ قرب و بعد نیست

می بینمت عیان و دعا می فرستمت

اب یہاں سے حضرت شمس العارفین شاہ ترکمان بیابانی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار مبارک کی زیارت کو جاتے ہیں۔ فاصلہ بہت کم تھا، دو تین منٹوں میں پہنچ گئے۔ سبحان اللہ بحمدہ کیا خوب فیض بار مزار ہے۔ یہاں بہت دیر تک حاضر رہے رہے اور بہت لطف آیا۔

بزرگان مسافر بجان پرورند

کہ نامِ نکو شان بعالم برند

آپ کی تاریخ وفات ۲۴/ رجب ۶۳۷ھ ہجری ہے۔ ہر برس عرس ہوتا ہے۔ اب تک آپ کی وفات کو چھ سو چوہتر برس ہوئے۔ میرے خیال میں یہ بات ہے کہ آپ سہروردی تھے اس لیے کہ ہندوستان میں پہلا دور سہروردیوں کا تھا۔ یہ بات میں اس قیاس سے کہتا ہوں کہ ہمارے پورب میں بھی اس عصر کے جو بزرگ ہیں وہ سب سہروردی ہیں۔ یعنی حضرت احمد یحیٰ منیری، حضرت شہاب الدین جگجوت، حضرت شاہ آدم صوفی رحمہم اللہ علیہم اجمعین۔ یہ سب بزرگوار پٹنہ میں اور اطراف پٹنہ میں آسودہ ہیں اور سب سہروردی ہیں، اور یہ سب حضرات حضرت خواجہ غریب نواز سیدنا و مولانا خواجہ معین الدین اجمیری قدس سرہ کے ہم زمانہ

ہیں اور یہ حضرت شاہ ترکمان قدس سرہ بھی انھیں کے ہم عصر ہیں۔ ان حضرات کے بعد دور چشتیوں کا ہے مگر حضرات چشت کا دور ایسا محیط ہوا کہ سب ہندوستان انھیں حضرات کا دار السلطنت ہو گیا اور وہ دار السلطنت دار الخیر اجمیر شریف ہے اور دیوان خانہ یعنی دار الوزارت دہلی شریف ہے۔ مگر جب سے ہمارے محبوب رب الارباب مولانا سیدنا امیر ابو العلا اکبر آبادی رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت خواجہ غریب نواز کی روح مبارک سے بطور اویسیت فیض یاب ہوئے تو یہ پورے جانشین آپ کے ہو گئے۔ اب اکبر آباد دیوان خانۂ اعظم ہو گیا الحمد للہ علی احسانہ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء واللہ ذوا الفضل العظیم۔ ملک اللہ کا، مخلوق اللہ کی، بندے اللہ کے؛ وہ خود فیّاضِ حقیقی جس کو جو کچھ چاہے عطا فرمائے، الامر للہ والحکم للہ۔ المختصر اب ہم حضرت شاہ ترکمان رحمۃ اللہ علیہ کے مزار مبارک سے باہر آئے اور لطف و کیفیت کے ساتھ باہر آئے۔

جو بندہ نوازی کرے، دل اس پہ فدا ہے
بے فیض اگر یوسفِ ثانی ہے تو کیا ہے

اب ہماری آنکھوں کے سامنے کلاں مسجد ہے۔ یہ مسجد جونا شہ المخاطب بخان جہاں ابن خاں جہاں وزیر نے فیروز شاہ کے عہد میں ۷۸۹ ہجری میں بنائی ہے۔ یہ مسجد ایک بلند ٹیکرے پر واقع ہے اور بتیس سیڑھیاں چڑھ کر داخل مسجد ہوتے ہیں۔ تمام شہر یہاں سے معلوم ہوتا ہے۔ اِس کی پیشانی پر یہ کتبہ ہے:

"بسم اللہ الرحمن الرحیم بفضل و عنایتِ آفریدگار در عہدِ دولتِ بادشاہِ دیندار الواثق بتائید الرحمن ابو المظفر فیروز شاہ السلطان خلد ملکہ ایں مسجد بنا کردہ بندہ زادہ درگاہ جونا شہ مقبول المخاطب خانِ جہاں خدا بر ایں بندہ رحمت کند۔ ہر کہ دریں مسجد بیاید بدعاے خیر بادشاہِ مسلمانان و ایں بندہ را بفاتحہ و اخلاص یاد کند۔ حق تعالی ایں بندہ را بیامرزد بحرمۃ النبی وآلہ۔ مسجد مرتب شد بتاریخ دہم ماہ جمادی الآخر سنہ ۷۸۹ تسع و ثمانین و سبع مأۃ ہجری۔"

اب تو یہ کالی مسجد مشہور ہے۔ یہاں ہم نے داخل ہو کر دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھی اور بانیِ مسجد اور اس کے بادشاہ کے واسطے اس کی وصیت کے موافق فاتحہ پڑھی اور ایک تسبیح درود شریف کی حضور پر نور صلی اللہ علیہ

وسلم کی روحِ مبارک کو نذر کی اور فرود گاہ کی طرف روانہ ہوئے۔ جنابِ شمس العلما منشی ذکاء اللہ خاں صاحب بہادر کا نیک بخت خدمت گار منیر خاں ہمراہ ہے۔ اس نے بہت قریب کے راستہ سے نواب پاٹودی کی کوٹھی پر پہنچا دیا۔ جب ہم فرود گاہ پر پہنچے تو وہی دونوں شائستہ خدمت گار حاضر تھے۔ ہماری صورت دیکھتے ہی باورچی خانہ کی طرف روانہ ہوئے، خاصہ کے ساتھ ایک صاحب پر تکلف لباس زیبِ جسم کیے اور ایک ننھّی سی بچی کو ساتھ لیے ہوئے تشریف لائے اور انھوں نے اپنے ہاتھ سے دستر خوان بچھایا۔ عند التحقیق معلوم ہوا کہ یہ صاحب شمشیر خاں بھیا رئیس گوالیار کی فوج کے برگیڈ میجر ہیں۔ نہایت خلیق اور منکسر آدمی ہیں۔ میں اکثر امرا سے کم ملتا ہوں اس لیے کہ گزی کا پیوند کمخواب میں نہیں لگتا مگر یہ مجھ سے خود ملے اور مجھے اپنے اخلاق سے محظوظ کر دیا۔

تواضع ز گردن فرازان نکوست
گدا گر تواضع کند خوے اوست

چونکہ پھرتے پھرتے آج ہم بہت تھک گئے، اس لیے آخر وقت سیر کا حوصلہ نہ ہوا، صرف کوٹھی کے احاطہ کے چکر کیے۔ شب کا کھانا کھایا اور معمولات سے فرصت کی اور استراحت کی۔

اب پنجم رجب ۱۳۱۱ھ کی صبح ہے اور سنیچر کا دن ہے۔ خبر گرم ہے کہ بعد مغرب ساچق عروس کے گھر جائے گی۔ ہم نے بھی قصد کر لیا کہ دن بھر کی مہلت ہے، دہلی کی سیر تو کر لو۔ اب جامع مسجد کا ارادہ ہے، کوٹھی کے پھاٹک سے نکل کر میدان میں آ گئے۔ مسجد شریف یہاں سے سامنے نظر آتی ہے۔ آنکھوں کے راستے سے کعبۂ دل میں اتر گئی۔ حق تو یہ ہے کہ ہندوستان میں تو اس کا جواب نہیں ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو کسی سانچے میں ڈھالا ہے۔ برجوں کا گٹھاؤ، میناروں کی راستی کچھ عجب عالم دکھا رہی ہے۔ لیجیے اب ہم داخل مسجد شریف ہو گئے، اللھم صل علی سیدنا ومولانا محمد وعلی آل سیدنا ومولانا محمد وبارک وسلم۔ صحن کی وسعت حضرت بایزید بسطامی قدس سرہ کے قلب شریف سے کم نہیں ہے۔ بیچ کے در کی محراب کی رفعت صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بلند حوصلہ کی شان دکھا رہی ہے۔ یہ محراب اس قدر بلند

ہے کہ آدھا گنبد چھپا ہوا ہے۔ سنگ مرمر کے گنبدوں پر سنگِ سیاہ کی تحریریں ہیں یا اوراق نور پر مشک کی جدولیں کھچی ہوئی ہیں یا حضرت یعقوب علیہ السلام کی آنکھوں میں زلفِ سیاہ حضرتِ یوسف علیہ السلام کی تصویر ہے۔

دہم شوال ۱۰۶۰ھ ہجری مطابق سنہ ۲۴ جلوس شاہجہانی موافق ۱۶۵۰ء عیسوی میں سعد اللہ خاں دیوان اعلی اور فاضل خاں خانساماں کے اہتمام سے بنیاد شروع ہوئی اور پانچ ہزار راج مزدور سنگ تراش روزانہ کام کرتے تھے۔ باوجود اس اہتمام بلیغ کے چھ برس میں بیس لاکھ روپیہ کے صرف سے تیار ہوئی ہے اور اس میں پانچ پانچ در اِدھر اُدھر ہیں، بیچ کے بڑے گیارھویں در کی محراب پر یاھَادِیٗ کا طغرا لکھا ہوا ہے، باقی اور دروں پر کتبہ شاہجہاں بادشاہ کا اور زرِ تعمیر و تاریخ وغیرہ لکھا ہوا ہے۔ اس مسجد کے شمال کی طرف کے شرقی دالان میں تبرکات جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے رکھے ہوئے ہیں۔ اور صحنِ مسجد میں ایک خوبصورت حوض ہے ایک سو چھتیس گز کے عرض و طول میں اور اس کے بیچ میں ایک نہایت دلربا فرحت بخش و روح افزا سنگِ مرمر کا دوسرا حوض ہے، پندرہ گز سے بارہ گز کا۔ اس کے بیچ میں فوارہ ہے۔ اس حوض کے غربی گوشہ پر ایک چھوٹا سا کٹہرا سنگ مرمر کا محمد حسین خاں محلی نے بنوا دیا ہے، اس واسطے کہ اس مقام پر بعض اولیاے اہل مشاہدہ نے حضرت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بیٹھے ہوئے دیکھا ہے، اس کٹہرہ پر یہ اشعار کندہ ہیں: کوثر محمد رسول اللہ ۱۱۸۰ھ ہجری، نظم ؎

رسول دیدہ اند اینجا ولی و اہل اللہ
بجا است گر شود ایں سنگ ہم زیارت گاہ
بنائے سال بہ تحسین و آفرین ہاتف
بگفت احاطہ جاے نشست رسول اللہ
۱۱۸۰ھ

بہیئت یہ مسجد اکبر آباد کی جامع مسجد سے چھوٹی معلوم ہوئی مگر ناپا تو بڑی نکلی، یعنی جنوباً و شمالاً یہ مسجد ایک سو چون قدم ہے اور اکبر آباد کی مسجد سو قدم ہے۔ ہم نے مسجد میں داخل ہو کر پہلے دو رکعت تحیۃ المسجد ادا کی،

پھر حضرت شاہ جہاں بادشاہ نور اللہ مرقدہ کے نام سے فاتحہ پڑھی، پھر نظرِ غور سے اس کی عمارت کے حسن پر دوبارہ نظر کی۔ میں نے اور جتنی مسجدیں دیکھیں تھیں عالمِ خیال میں سب سے اس کا مقابلہ کیا، مگر یہی اول درجہ کی ٹھہری۔ حیدرآباد کی مکہ مسجد بھی اپنی قطع کی ایک ہی ہے اور حسن تعمیر میں وہ بھی ایک خاص ادا رکھتی ہے مگر یہ مسجد حقیقت میں اپنا جواب آپ ہی ہے۔ مکہ مسجد چوراسی قدم عرض میں ہے اور ایک سو چودہ قدم طول میں۔ صحن مسجد کے جنوب کی طرف فرماں روایانِ حیدر آباد کے مزارات نہایت خوشنما سنگ مرمر کی جالیوں سے گھرے ہوئے ہیں، یہ دنیا میں بھی خوش نصیب تھے اور مرنے کے بعد بھی خوش نصیب ہیں کہ ان کی روحیں پنجگانہ نماز میں شریک ہوتی ہوں گی۔ نواب میر نظام علی آصف جاہ کا سن وفات جو ان کی قبر پر کندہ ہے ۱۲۱۸ھ ہجری ہے۔ نواب سکندر جاہ کا سنہِ وفات ۱۲۴۴ھ ہے۔ نواب ناصر الدولہ کا سنہِ وفات ۱۲۷۳ھ ہے۔ نواب افضل الدولہ بہادر جنت آرام گاہ کا سالِ وفات ۱۲۸۵ھ ہے۔ یہ نیک مزاج باخدا بادشاہ فقرا و علما کا محبوب تھا، اس کا اثر یہ ہوا کہ اُس کی نمازِ جنازہ غائبانہ حرمین شریفین میں پڑھی گئی اور آج تک اکثر اہلِ طریقت فاتحہ پڑھتے ہیں اور اس کے جانشینِ حال کی بقاے سلطنت اور درازیِ عمر کی دعا کرتے ہیں۔ چونکہ اس اسلامی ریاست کا ذکر آگیا ہے لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کچھ مختصر حال اس کا یہاں پر تحریر کر دیا جائے یا اللہ تو اپنے حبیب سیدنا محمد مصطفی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی روحِ مبارک کے طفیل اس اسلامی ریاست کو ہمیشہ چشم زخم سے بچائیو۔ آمین یارب العالمین آمین ثم آمین۔

## فائدہ

یہ سلطنت طبقۂ سیادت میں شمار کی گئی ہے۔ رئیسِ اول میر قمر الدین فتح جنگ آصف جاہ نظام الملک نور اللہ مرقدہ تھے۔ یہ ۱۰۸۲ھ ہجری میں پیدا ہوئے اور ۱۱۳۷ھ ہجری میں جب چھپن برس کی عمر تھی تو رئیس ہوئے۔ ان کے بعد میر احمد نظام الدولہ ناصر جنگ فرزندِ دوم آصف جاہ ۱۱۶۱ھ ہجری میں رئیس ہوئے۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی اِن کے استاد تھے، یہ فرانسیسیوں کے معرکہ میں شہید ہوئے۔ ان کے بعد ان کے بڑے فرزند فیروز جنگ اسی سال مسند نشین رہاست ہوئے۔ ان کی سوتیلی ماؤں نے انھیں زہر دیا، یہ بھی

شہید ہوئے۔ ان کے بعد ۱۸ محرم ۱۱۶۴ھ ہجری کو محی الدین خانِ آصف جاہ کے نواسے تخت نشین ہوئے۔ انھوں نے بھی فرانسیسیوں کے ہاتھ سے جامِ شہادت نوش کیا۔ ان کے بعد امیر الممالک میر محمد خاں صلابت جنگ آصف جاہ کے فرزندِ سوم تخت نشین ہوئے، اِن کو اِن کے چھوٹے بھائی نظام علی خاں نے ۱۱۷۵ھ ہجری میں قید کر لیا، یہ بستم ربیع الاول ۱۱۷۷ھ ہجری میں واصل بحق ہوئے۔ ان کی جگہ نظام علی خاں ۱۱۷۵ھ ہجری میں سریر آرائے دکن ہوئے، اِن کی ولادت ۱۱۴۶ھ ہجری اور وفات ۱۲۱۸ھ ہجری میں ہے۔ ان کی جگہ میر اکبر علی خاں سکندر جاہ ۱۲۱۸ھ ہجری میں تخت نشین ہوئے۔ ان کی ولادت ۱۱۸۷ھ ہجری میں ہوئی اور وفات ۱۷/ ذیقعدہ ۱۲۴۴ھ ہجری میں۔ اِن کے بعد فرخند علی خاں ناصر الدولہ آصف جاہ چہارم فرزند سکندر جاہ مسند نشین ہوئے۔ ۱۱/ جمادی الاول ۱۲۰۸ھ ہجری میں پیدا ہوئے اور ۱۲۴۴ھ ہجری میں ریاست پائی۔ ۲۳ رمضان المبارک ۱۲۷۳ھ ہجری میں وفات کی۔ ان کے بعد میر تہنیت علی خاں افضل الدولہ آصف جاہِ پنجم ۱۲۴۲ھ ہجری میں پیدا ہوئے اور ۱۲۷۳ھ ہجری میں رئیس ہوئے اور ۱۲/ ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ ہجری میں اللہ سے ملے۔ چنانچہ ان کی نیک نہادی کا ذکر ہو چکا ہے، اور اب جو رئیس حال ہیں وہ سلطان ابن سلطان امیر المسلمین میر محبوب علی آصف جاہ خلد اللہ ملکہ افضل الدولہ خلد مکان کے فرزند ہیں۔ یہ ۷/ ربیع الثانی روز سہ شنبہ ۱۳۰۱ھ مطابق پنجم فروری ۱۸۸۴ء عہدِ گورنر جنرل لارڈ رِپن میں رئیس ہوئے اور عنانِ حکومت دست مبارک میں لی۔ اس فقیر نے ان کا سکّہ اور تاریخ کہی ہے۔

سکّۂ حضور پر نور حضرت سلطانِ دکن خلد اللہ ملکہ

سکہ زد بر زر و بر سیم شہِ ظلّ اللہ ‏ ‏ ‏ ‏ میر محبوب علی شاہِ دکن آصف جاہ

تاریخِ تخت نشینی حضور پر نور حضرت سلطانِ دکن خلد اللہ ملکہ

خدیو عادل و عالم پناہ شاہِ دکن ‏ ‏ ‏ ‏ رئیس ابنِ رئیس و امیر ابنِ امیر
حسین چو یوسف کنعان وجیہ چون عیسی ‏ ‏ ‏ ‏ بملک داری و صولت قبادِ کشور گیر
سکندر است باقبال و خسرو است بفوج ‏ ‏ ‏ ‏ بنظمِ مملکت او ہست چون فریدون پیر

سہ شنبہ بود کہ در ہفتم ربیع دوم جلوس کرد بہ تختی کہ ہست عرش نظیر
سنہ جلوسِ سریرِ جواہرین اکبرؔ سریرِ دولتِ منصورہ شد طرازِ سریر

## قطعہ دیگر

شہِ داد گر بادشاہِ دکن بود دولتش تا ابد برقرار
بروزِ ہمایون و سالِ سعید شد آن شہریارِ دکن تاجدار
دُرِ آبدارِ دعا می کنم بفرقِ امیرِ دلاور نثار
الہی! زفیضِ عنایاتِ تو بود ملک او پاک ز آسیبِ خار
دلم سالِ مسند نشینی بگفت مبارک سریر ہمیشہ بہار

آمین یارب العالمین آمین ثم آمین۔

اب ہم شہر جونپور کی ان دونوں سنگین اور پرانی مسجدوں کا ذکر کرتے ہیں جو لودی پٹھانوں کی سلطنت سے بھی پہلے کی ہیں۔

## اٹالہ والی مسجد

یہ مسجد سنگ سرخ کی ہے۔ اس کی کرسی بہت بلند ہے۔ تعمیر اس کی مضبوط بہت ہے مگر شاہجہانی نزاکت اسے کہاں نصیب۔ اس کا عرض نوے قدم ہے۔ دوسری جامع مسجد یہ بھی اُسی قطع کی ہے، اِس کا عرض ایک سو آٹھ قدم ہے۔

## مسجدِ قرطبہ

یہ مسجد سنہ ۹۰ ہجری میں عبد الرحمن اول نے بنائی ہے۔ یہ ملک اُندلس کے بادشاہ تھے۔ اتنی بڑی مسجد اس اہتمام بلیغ سے مساجد ثلاثہ کے بعد تمام دنیا میں اول یہی بنائی گئی ہے۔ ڈیڑھ سو قدم عرض میں ہے جنوباً و شمالاً اور دو سو قدم طول میں ہے شرقاً و غرباً۔ چار ہزار سات سو قندیلیں اس کے آسمانہ میں آویزاں

ہوتی ہیں اور اس میں ایک ہزار ترانوے ستون ہیں۔ پچیس لاکھ روپیہ کے صرف سے آٹھ برس کے عرصہ میں بن کر تیار ہوئی۔ یہ اندلس[۲] وہ مقام ہے کہ تخمیناً سات سو برس تک مسلمانوں کا دار الحکومت رہا ہے اور بڑے بڑے نشانات اسلامی عمارتوں کے آج تک وہاں موجود ہیں۔ اسلام کے بڑے بڑے علما وہاں پیدا ہوئے۔ یحییٰ اندلسی جامع موطا حضرت امام مالک رضی اللہ عنہ اسی سرزمین میں پیدا ہوئے۔ محی الدین ابن عربی صاحبِ فتوحاتِ مکیہ و فصوص الحکم یہیں سے ظاہر ہوئے۔

قرطبہ یہ وہ شہر ہے کہ جس میں تین ہزار آٹھ سو سینتیس مسجدیں تھیں، نو سو حمام تھے۔ یہاں کی میونسپلٹی کا یہ اہتمام تھا کہ عام صحت کے واسطے ہوا عطر بیز کی جاتی تھی۔ دو لاکھ گھر مسلمانوں کے تھے، چھ سو مساجد جامع، پچاس شفاخانہ، اسّی عام مدارس۔ جو عمدہ محلات اس میں تھے اور ان کی تعمیر میں عجیب و غریب صنعتیں کیں تھیں، ان کے نام یہ ہیں: قصر الزہراء، کامل، مجدد، قصر الحائر، روضہ مبارک، قصر السرور، رشیق، تاج، بدیع۔ اسی اندلس میں اول اول مدرسۂ حربیہ قائم ہوا ہے، بالکل فنون سپہ گری یہاں تعلیم ہوتے تھے اور فنِ سپہ گری کے ساتھ فنِ جہاز رانی کے بھی تعلیم ہوا کرتی تھی۔ اللہ اللہ ایک وہ زمانہ تھا کہ مسلمانوں کی تعلیم نے تمام یورپ کو شائستہ کر دیا اور ایک یہ زمانہ ہے۔

بہ بیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

ایک انگریزی مورخ لکھتا ہے کہ مسلمانوں کی کتب اسماء الرجال میں پانچ لاکھ علما کا حال مل سکتا ہے۔ وہاں بعض درس کے حلقے ایسے تھے کہ جن میں دس دس ہزار طلبہ موجود رہتے تھے اور معمولی حلقہ ہائے درس تو ایسے بہت تھے جن میں ہزار بارہ سو طلبہ رہتے تھے۔ اے مسلمانو! خدا کے واسطے اپنی شوکت آئندہ پر نظر کرو اور اپنے سنوارنے کی فکر میں مصروف ہو جاؤ۔

مشکلے نیست کہ آسان نشود　　　مرد باید کہ ہراسان نشود

---

۲۔ اندلس یہ ملک شام سے مغرب کی طرف کچھ شمال کی طرف دبتا ہوا اوپر کو واقع ہے۔ قرطبہ اس کا اس وقت دار السلطنت۔ اس شہر میں ایک دار القضا تھا، صرف متخاصمین اور قاضی کی جگہ چھوڑ کر تمام مکان زیر و بالا، یمین و یسار آیات قرآنی جس میں احکام تھے لکھی ہوئی تھیں کہ وقت انفصال مقدمہ یہ سب قاضی کے پیش نظر ہوں، اسے کتاب دیکھنے کی ضرورت نہ ہو۔

اب وہی اندلس ہے کہ جس کا نام اسپین رکھا گیا ہے اور نصرانیوں کا نشان لہرا رہا ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اب ہم شمال کے دروازے کی طرف سے اترتے ہیں اور حکیم سرمد رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کی زیارت کو جاتے ہیں۔ بہت تھوڑا فاصلہ ہے، بات کی بات میں طے ہو گیا۔ یہاں دو مزار ہیں، ایک تو آپ ہی کا مزار ہے اور آپ کے سرہانے حضرت شاہ ہرے بھرے رحمۃ اللہ علیہ کا مزار ہے۔ ان کی کوئی تاریخی کیفیت معلوم نہیں، صرف اتنا ہی مشہور ہے کہ یہ سرمد رحمۃ اللہ علیہ کے مرشد ہیں۔ حال حضرت سرمد رحمۃ اللہ علیہ کا اہل تاریخ نے لکھا ہے کہ یہ جرمن[۳] قوم کے نصاریٰ تھے اور علوم ادبیہ میں مہارت کامل رکھتے تھے۔ عربی فارسی میں بالغ استعداد تھی۔ سوداگری کے ذریعہ سے ہندوستان میں آئے لیکن ان کمالوں کے ساتھ فن عشق میں بھی ید طولی رکھتے تھے۔ لاہور میں یہ جب پہنچے تو ایک ہندو جوہری بچہ کے دام گیسو میں الجھ کر رہ گئے۔ عاشق اور غلام کا تو وہی مذہب ہوتا ہے جو اس کے معشوق اور مالک کا ہو۔ انھیں بھی ہندو ہونا ضروریات سے تھا۔ چند سال تک بہت شور و شغب رہا۔ جب وہ لڑکا مر گیا تو وحشت نے اور پاؤں نکالے، اب عشق سے جنون کی نوبت آئی۔ تمام مال لٹا دیا، یہاں تک کہ برہنہ ہو گئے اور شرمگاہ تراش ڈالی۔ چندے اس کے صدمہ میں مبتلا ہو کر ذی فراش رہے، جب تندرست ہوئے تو دہلی کا رخ کیا۔ اس زمانے میں دہلی اپنے پورے شباب پر تھی اور دارا شکوہ کے ہاتھ میں عنانِ حکومت، اس پر وہ فقرا کا نہایت معتقد۔ وہ ایک جوانِ طناز اور یہ ہمہ تن عشق باز۔ بھلا قطع برید سے کیا ہوتا ہے، وہ مادہ کہیں ایسی کانٹ چھانٹ سے کم ہوتا ہے۔ اس مادۂ عشق کے ہیجان کی روک تھام دو چیزوں کے بندوبست سے ہوتی ہے یعنی سماعت و بصارت، یہ دونوں چیزیں ان کی علی حالہ تھیں۔

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد
بسا کین دولت از گفتار خیزد

۳۔ بعض وجوہ سے ثابت ہوتا ہے کہ جرمنیوں میں مادۂ عشق یورپ کی سب قوموں سے زیادہ ہوتا ہے۔ کلکتہ میں جو یورپین ارباب نشاط ہیں، وہ اکثر جرمنی لیڈیاں ہیں۔

مگر چونکہ یہ فنِ ادب اور علمِ مجلس اور آئینِ عشق و قانونِ تصوف سے علی وجہ الکمال ماہر تھے، داراشکوہ کو ایسی تسخیر کی نگاہوں سے گھورا کہ وہ ان کا پورا مسخر ہو گیا۔ اب یہ حکیم سرمد یا عاشق سرمد سے مجذوب سرمد ہو گئے۔

## اقسامِ سلوک

سلوک کی چار قسمیں ہیں: پہلا سلوک بعد جذب۔ دوسرا جذب بعد سلوک۔ تیسرا جذب غیر سلوک۔ چوتھا سلوک غیر جذب۔

اہلِ تحقیق کے نزدیک پہلے اور دوسرے کے ساتھ اقتدا ہو سکتا ہے اور تیسرے اور چوتھے کے اقتدا میں تامل اور سکوت کیا ہے اور نہایت صحیح و عمدہ عرفاے کاملین کے نزدیک سلوک بعد الجذب ہے۔ الحمدللہ علی احسانہ کہ طریقہ ابو العلائیہ اس دولت سے بطور خصوصیت مالا مال ہے اور بعد اس کے جذب بعد السلوک ہے۔ حضرت سرمد رحمۃ اللہ علیہ تیسری قسم میں سے شمار کیے جاتے ہیں یعنی جذب بحت۔ (۴)

مگر میری سمجھ میں اِن کا جذب بحت آتا نہیں۔ اس لیے کہ جذب بحت کی یہ تعریف ہے کہ وہ بالکل از خود رفتہ ہو۔ اور یہ ایسے ہوشیار تھے کہ عمدہ عمدہ مضامین کی رباعیاں اِن کی موجود ہیں اور یہ سب فنِ شعر سے درست۔ اوزان شعر میں رباعی کا وزن بہت نازک ہے، مگر اِن کے قلم نے کہیں لغزش نہیں کی، لیکن برہنہ ضرور رہتے تھے۔ جب حضرت عالمگیر نور اللہ مرقدہ نے اِن کو لباس پہنایا تو انھوں نے تھوڑی دیر کے بعد لباس اتار کر پھینک دیا اور یہ رباعی نظم کی۔ رباعی ؎

آں کس کہ ترا تاجِ جہانبانی داد      ما را ہمہ اسبابِ پریشانی داد
پوشاند لباس ہر کرا عیبے دید      بے عیبان را لباس عریانی داد

جب کسی طرح سے یہ لباس کی قید میں نہ آئے تو آخر کو حسبِ حکمِ شرع شریف علمانے ان کے قتل پر مُہر کی۔ اس میں غریب عالمگیر کا کیا قصور ہے۔ کیا مسلمانوں کو یہ بات معلوم نہیں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ

---

۴۔ بحت بمعنی خالص وصرف و مخلص

نے اپنے پیارے فرزند ابو شحمہ پر حد شراب کی جاری کی۔ ہر چند صحابہ نے ان کی سفارش کی مگر آپ نے ہر گز خیال نہ کیا اور فرمایا کہ اللہ پاک کے حکم میں سفارش اور شفقت کو دخل نہیں ہے۔ اگر ایسا کوئی حکم ہوتا ہے تو آپ سے زیادہ شفقت کرنے کا اپنے فرزند پر میں مستحق تھا۔ آخر کو حد لگائی گئی اور وہ دس ہی درّوں کے صدمہ سے راہی خلد ہوئے۔ اب اگر کوئی حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر اعتراض کرے تو میں اسے بخوشی عالمگیر پر بھی اعتراض کرنے کی اجازت دیتا ہوں۔ حضرت سیدنا علی اور حضرت سیدنا عقیل رضی اللہ تعالی عنہما دونوں حقیقی بھائی ہیں، سب سے بڑے عقیل جن کے فرزند حضرت مسلم تھے اور عقیل سے چھوٹے جعفر طیار، ان سے چھوٹے حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہم اجمعین۔ حضرت علیؓ اور حضرت عقیلؓ سے رنجش تھی، حضرت علی ان پر تلوار لے کر دوڑے، اگر وہ بھاگ نہ جائیں تو قتل ہی ہو جاتے۔ پھر کیا کوئی مسلمان معاذ اللہ منہا ان دونوں حضرات کی طرف سے دل برا کر سکتا ہے۔ حضرت امیر معاویہؓ اور حضرت عقیل سے بڑی محبت تھی اور حضرت علی علیہ السلام سے اور حضرت معاویہؓ سے لڑائیاں ہو رہی تھیں۔ ہم کو اس میں کیا دخل، ہمارے خیال میں ان کی جنگ بھی اللہ کے واسطے تھی اور ان کی صلح بھی اللہ کے واسطے تھی۔ لہٰذا اہلِ دانش کو ایسے مقام پر سکوت ہی مناسب ہے، حدیث شریف میں وارد ہے: الصمت أفضل من عبادة ستين سنة۔ ترجمہ: یعنی ایک ساعت کا سکوت ساٹھ برس کی عبادت سے بہتر ہے۔

میں بے تعصب مسلمانوں سے پوچھتا ہوں کہ اگر آپ سچے اللہ والے مفتی ہوں اور آپ کے سامنے ایسا شخص پیش کیا جائے کہ سمجھ بوجھ تو اس کی حکیمانہ ہو اور اپنے نیک و بد سے بھی خبر دار ہو اور باوجود اتنی ہوشیاری کے نہ نماز پڑھے، نہ روزے رکھے اور برہنہ بھی ہو اور شراب خوار بھی تو اس کے نسبت آپ کیا حکم دیں گے۔ ماھو جوابکم فھو جوابنا۔ حضرت سرمد رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر یہ تاریخ کندہ ہے۔ قطعہ

شاہِ سرمد در عہدِ عالمگیر
چون سفر ساختہ بخلدِ بریں
گفت تاریخ اکبرِ مسکیں

لحدِ مرقد شہیدِ سرمد ایں

یہ تاریخ میرے کسی ہم نام کی ہے مگر مصرع اول میں جو "در عہد" ہے اس کا عین تقطیع سے گر گیا ہے۔ یا تو کاتب کی غلطی ہے، اگر بعہد ہو تو یہ بات رفع ہو جائے یا واقعی شاعر سے یہ لغزش ہو گئی۔

دوسرا اعتراض حضرت عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ پر دارا شکوہ رحمۃ اللہ علیہ کے قتل کا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جب شاہجہاں پادشاہ رحمۃ اللہ علیہ عارضہ حبسِ بول میں مبتلا ہو کر اپنی زندگی سے ناامید ہوئے تو اس وقت ان کے بیٹوں میں سے ان کے پاس صرف دارا شکوہ موجود تھے۔ عنانِ سلطنت ان کے ہاتھ میں دے کر آپ گوشہ نشین ہو گئے۔ جب عالمگیر نے بادشاہ کی علالت کی خبر سنی تو دکن سے عیادت کے لیے روانہ ہوئے۔ جب دارا شکوہ کو عالمگیر کی آمد کی خبر پہنچی تو جا کر اجمیر شریف میں ان کو روکا۔ وہاں محاربہ سخت فریقین میں واقع ہوا، عالمگیر کی فوج چونکہ بہت قلیل تھی، پیچھے کو ہٹی۔ دارا شکوہ ہاتھی پر سوار تھے، فوراً اتر پڑے اور یہ قصد تھا کہ گھوڑے پر سوار ہو کر عالمگیر کی فوج کا تعاقب کیجیے، مگر مشیت الٰہی کا بندوبست کون کر سکتا ہے۔ دارا شکوہ کی فوج نے جو اپنے بادشاہ کی عماری خالی دیکھی، خیال کیا کہ بادشاہ مارا گیا۔ دفعتاً ظفریاب فوج کے قدم اٹھ گئے۔ عالمگیر نے جو یہ حالت دیکھی اپنے گھوڑے کو آگے دوڑا کر فوج کو روک رکھا اور کہا کہ اے دلیرو! تم کو شرم نہیں آتی کہ تم بھاگی ہوئی فوج سے بھاگتے ہو۔ بس فوراً عالمگیر کی فوج پھر پڑی اور دارا شکوہ نے راہ فرار اختیار کی، عالمگیر فتح مند ہوا۔

عروسِ ملک کسے در کنار گیرد تنگ
کہ بوسہ بر لبِ شمشیر آبدار زند

اللہ کا آسمان، اللہ کی زمین، اللہ کے بندے، مستقل مالک وہ خود ہے، جس کو چاہے دے۔ کسی دوسرے کو اس میں کیا دخل۔ أعوذ باللہ من الشیطان الرجیم قل اللھم مالك الملك تؤتی الملك من تشاء وتنزع الملك ممن تشاء وتعز من تشاء وتذل من تشاء بیدك الخیر إنك علی كل شیء قدیر۔ اللہ پاک ملک کا مالک ہے، وہ جس کو چاہتا ہے بادشاہ کرتا ہے اور جس سے چاہتا ہے بادشاہی چھین لیتا ہے۔ جس کو چاہتا ہے

عزت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ذلیل کرتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ہر طرح کی خیر ہے۔ ہم دخل در معقولات کرنے والے کون، فی الحقیقت وہ ہر شے پر قادر ہے اور حکیم مطلق وہی ہے۔

## قانونِ قدرت

آدمی کی طبیعت آسانی اور آزادی پسند ہے۔ جہاں اس کی ڈور ذرا بھی ڈھیلی ہوئی اور یہ کسی طرف کو بھاگ نکلا۔ اسی لیے اللہ تعالی شانہ پیغمبروں میں سے بھی ایک نرم ایک گرم بھیجتا رہا۔ حضرت موسی علیہ السلام کا مزاج سخت تھا، ان کے بعد حضرت عیسی علیہ السلام نہایت ہی بردبار مزاج کے نبی بھیجے گئے۔ اوپر کے پیغمبروں کا سلسلہ بھی یوں ہی ہے۔ بادشاہوں میں بھی یہی قانون قدرت نے جاری رکھا ہے۔ بابر ہمایون ذرا سخت تھے، اکبر بادشاہ نہایت ہی نرم مزاج تھا۔ جہانگیر ذرا تند مزاج تھا، شاہجہاں اس کے بعد نہایت ہی حلیم آئے۔ اسی قانون کے جاری کرنے والے نے عالمگیر کو شاہجہاں کے بعد بھیجا ہے۔ طریقہ ہندوستان میں گورنروں کے بھیجنے کا ہے، گورنروں کی تاریخ دیکھنے سے معلوم ہو جاتا ہے جو کچھ ہے اسی کی طرف سے ہے ع

ہرچہ ہست از یار ہست اغیار نیست

روزانہ ہم ایسے ایسے بہت حیرت ناک واقعات دیکھتے ہیں، مگر اس طرف نگاہِ غور نہیں کرتے۔ وگرنہ تمھاری آنکھیں اور دل بہت کچھ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ طریقہ ابوالعلائیہ میں یہ نظر اور فکر اذکار پر مقدم ہے، اسی وجہ سے اس طریقہ عالیہ کا سالک بہت جلد ترقی کرتا ہے۔

تیسرا اعتراض عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ پر یہ ہے کہ اپنے باپ کو قید کیا، ھذا بھتان عظیم۔ جس وقت شاہجہاں گوشہ نشین ہوئے ہیں تو ان کے پاس دارا شکوہ موجود تھے، نہ عالمگیر۔ پس یہ اعتراض دارا شکوہ پر قائم ہو سکتا ہے نہ عالمگیر پر۔ جب عالمگیر فتح مند ہو کر باپ کی خدمت میں سلام کو حاضری ہوئی تو اپنی تلوار کمر سے کھول کر باپ کے سامنے رکھ دی اور آپ کھڑے ہو کر مورچھل سے مگس رانی کرنے لگے۔ شاہجہاں نے تھوڑی دیر کے بعد وہ تلوار اپنے ہاتھ سے عالمگیر کی کمر میں باندھ دی۔ اصل سخن اسی قدر ہے اور تاریخیں بھی اسی کے قریب قریب ہیں لیکن متعصب لوگوں نے رنگ آمیزیاں بہت کیں ہیں۔ اللہ تعالی

شانہ ان کو جزائے خیر دے۔ مجھ کو نہ عالمگیر سے قرابت نہ دارا شکوہ سے رشتہ، میری نظر سے جو باتیں گذری ہیں وہ بے تعصب ہو کر لکھ دیں۔ نعمت خاں عالی نے عالمگیر کو بہت زیادہ بدنام کیا اور اس کا سبب اہل تاریخ اور اہل علم پر مخفی نہیں ہے۔ مجھ سے چاہے کوئی بیزار ہو یا خوش اس کی مجھے پروا نہیں۔ میں جہاں اور بادشاہان اسلام کا فاتحہ پڑھتا ہوں، وہاں عالمگیر کا بھی میرے صفحۂ دل پر لکھا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ شانہ قبول فرماوے۔ آمین ثم آمین!

اب ہم حضرت سرمد رحمۃ اللہ علیہ کے مزار سے فاتحہ پڑھ کر رخصت ہوئے اور حضرت شاہ کلیم اللہ جہان آبادی قدس اللہ سرہ العزیز کی زیارت کو جاتے ہیں اور وہ بقعۂ نور یہاں سے نظر آرہا ہے۔ دل بے ساختہ اس طرف کھینچا جاتا ہے۔ الحمد للہ کہ مزار مبارک پر پہنچ گئے۔ مزار ہے یا منبعِ فیض۔ یہ مزار مبارک ایک چونہ گچی کے چبوترے پر ہے جو زیرِ آسمان ہے، ۱۳ قدم عرض میں شرقاً و غرباً ہے اور ۲۲ قدم طول میں جنوباً و شمالاً ہے۔ چار درخت مولسری کے ابھی تازہ لگائے گئے ہیں۔ سرہانے کی طرف لوح پر کسی قطعہ کے یہ دو شعر کندہ ہیں۔

فضل و کمالِ خویش بود
مرہمِ قلبِ ریش بود
سالِ وصالش بگفتہ ہاتف
قطبِ زمانۂ خویش بود
۱۱۴۲ھ

آپ حضرت مولانا محمد فخر الدین دہلوی قدس سرہ کے دادا پیر ہیں۔ چشتی تو اس مزار سے فیض یاب ہوتے ہی ہوں گے اس لیے کہ ان کا مرجع اور ماویٰ یہ بقعۂ نور ہے۔ مگر اور طریقہ کے سالک بھی محروم نہیں رہتے۔ لکڑی کے سبز کٹہرے سے یہ مزار گھرا ہوا ہے۔ اس مقام سے ایک چھوٹی سے دلچسپ مسجد بہت قریب میدان میں نظر آرہی ہے۔ معلوم ہوا کہ اس کا نام سنہری مسجد ہے، اس کی بھی زیارت کر لیا چاہیے۔ سبحان اللہ کیا پاکیزہ مسجد ہے۔ اندر سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ تمام پھول بیل پتیاں سنہری ہیں اور ایسا عمدہ کام ہے

جیسے نہایت سبک دست سادہ کار میناکار زیور بناتے ہیں۔ اس کے تینوں برج سونے کے پتروں سے منڈھے ہوئے تھے، مگر اب وہ پتّرے کسی خزانے میں جمع ہوں گے ع

که زرزر کشد در جہان گنج گنج

اس مسجد کو دیکھ کر بڑی حسرت ہوئی، ایسی پڑی ہے کہ دو رکعت نفل پڑھنے کا بھی موقع نہ ملا۔ بیچ کے در کے محراب میں یہ تاریخ کندہ ہے۔ قطعہ

شکرِ حق در عہدِ احمد شاہ غازی بادشاہ — خلق پروردا گر شاہانِ عالم را پناہ
مسجدے کردہ بنا نوابِ قدسی منزلت — بادوایم فیضِ عام آن ملایک سجدہ گاہ
سعی نواب بہادر صاحبِ لطف و کرم — ساخت تعمیرے چنین جاوید عالی دست گاہ
چاہ و حوضے ساخت صحنش آبروے زمزم است — ہر کہ از آبش طہارت ساخت شد پاک از گناہ
سال تاریخش چہ خرّم یافت از الہامِ غیب — مسجدِ بیتِ مقدسِ مطلعِ نورِ الہ
۱۱۶۴ھ

اس مسجد کے معاینہ کے وقت میرے ساتھ اتنے آدمی تھے: سید نصیر الدین دہلوی، سید اعجاز حسین دہلوی، شاہ امین الدین قیصر الہ آبادی، شاہ محمد ظہور رئیس مانک پور، مولوی محمد ولی اللہ رئیس راے بریلی، شاہ ثامن علی رئیس سلون۔ اور سب کے سب آبدیدہ تھے اور ایک عجب حالت یاس و حسرت کی تھی۔ بعض آنکھیں کثرت بُکا سے چشمِ عاشق بن گئی تھیں۔ بعد افاقہ مسجد شریف سے باہر آئے اور حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کے سلام کو چلے۔ چاندنی چوک میں وہ دوسری سنہری مسجد ملی جس پر نادر شاہ سفاک نے بیٹھ کر قتلِ عام کیا تھا۔ اسی مسجد کے پاس کوتوالی بھی ہے۔ اس مسجد کو بھی سلام کر لینا ضروریات سے تھا، کیونکہ اس صاحب جلال کا ایک مظہر یہاں اپنی شان دکھا گیا ہے۔ مسجد میں حاضر ہوئے اور بہت ادب سے فرشی سلام کیا اور دو رکعت نماز تحیۃ المسجد ادا کی اور حضرت شاہ بھیکہ صابری قدس سرہ کے حضور میں فاتحہ پڑھی۔ یہ مسجد آپ ہی کے کسی معتقد نے آپ کے نام پر بنائی ہے۔ مسجد کی پیشانی پر یہ تاریخ کندہ ہے، قطعہ

بعہدِ بادشاہ ہفت کشور — سلیمان فر محمد شاہ داور

به نذر شاهِ بھیکه آن قطب آفاق — شد این مسجد بزینت در جهان طاق
خدایا نیست لیک از روے احسان — بنام روشن الدوله ظفـــر خان
بتاریخش ز ہجرت در شمار است — ہزار و یک صد و سی و چهار است

ڈرتے ہی ڈرتے اس مسجد میں آئے، پھر انھیں قدموں باہر آئے۔ پہلے قدم رسول میں حاضر ہوئے، حافظ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ شعر زبان پر تھا، اس شعر کا لطف جیسا یہاں آیا کبھی نہ آیا تھا۔

بر زمینے که نشان کفِ پاے تو بود
سالها سجده صاحبِ نظران خواهد بود

جب افاقہ ہوا تو چند تسبیحیں درود شریف کی پڑھیں اور ظہر کی نماز مسجد میں پڑھی اور حضرت باقی باللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دربار کی طرف روانہ ہوئے۔ اس مزار مبارک پر خالص نقشبندی نسبت کی بارش ہو رہی ہے۔

نقشبندیہ طریقہ ایک ایسا طریقہ ہے کہ اس کا لطف اس کے برتنے والے ہی جانتے ہیں۔ حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند قدس اللہ تعالیٰ سرہ العزیز ارشاد فرماتے ہیں۔

اوّلِ ما آخر ہر منتہی
آخرِ ما جیبِ تمنا تہی

شرح: جملہ طرق کا اصول یہ ہے کہ پہلے مرید کی ابجد اذکار وغیرہ سے شروع کرتے ہیں اور بعد عرصۂ دراز کے اشغال کی طرف لے جاتے ہیں۔ انتہاے کار اس کا مراقبہ پر ہوتا ہے اور اس طریقہ عالیہ میں مراقبہ ہی ابجدِ اہل سلوک ہے اور آخر اس طریقہ کا تمام خواہشات اور تمناؤں سے بے نیاز ہو جانا ہے۔ کیا خوب کہا ہے جس نے کہا ہے۔

سراپا آرزو ہونے نے بندہ کر دیا ہم کو — وگرنہ ہم خدا تھے گر دلِ بے مدعا ہوتا

مَنْ فَہِمَ فَہِمَ وَمَنْ ذَاقَ ذَاقَ۔ حضرت جامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

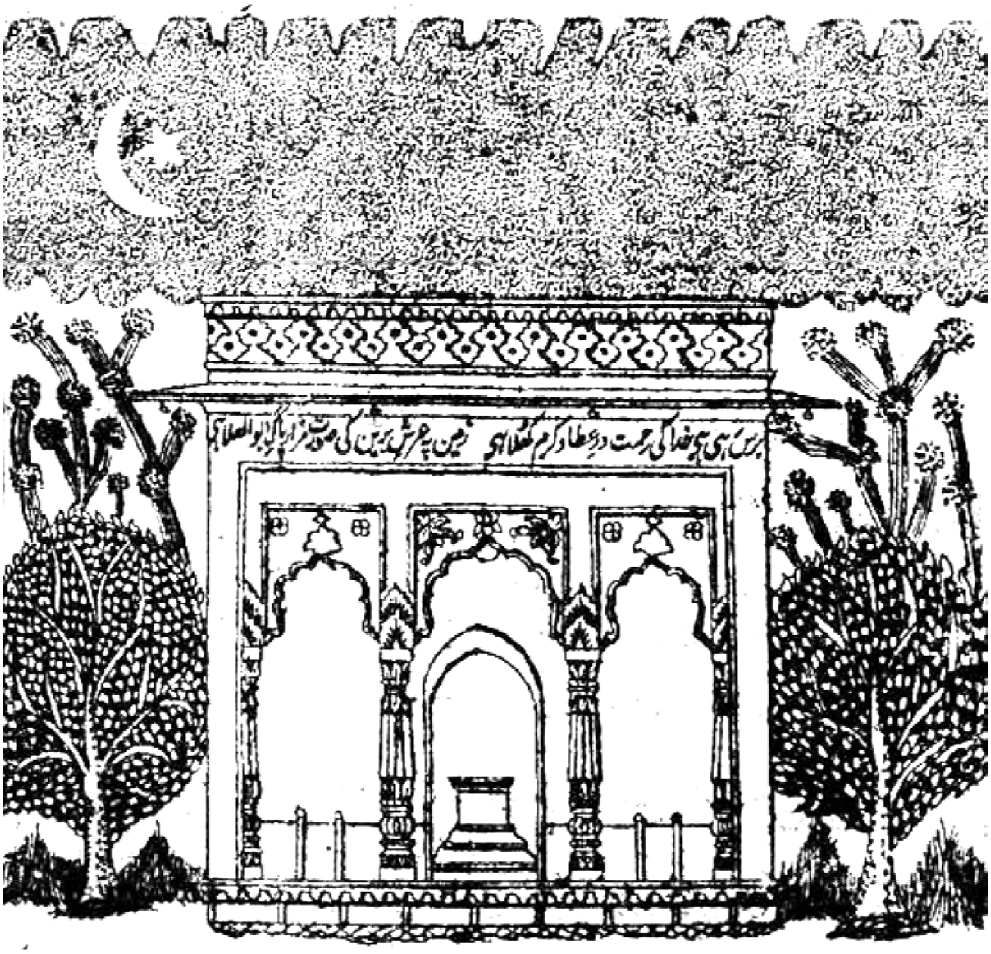
نقشبندیہ عجب قافلہ سالار انند — کہ برند از رہِ پنہاں بحرم قافلہ را
ہمہ شیران جہاں بستۂ ایں سلسلہ اند — روبہ از حیلہ چساں بگسلد ایں سلسلہ را

## طریقہ نقشبندیہ ابو العلائیہ کا حال

اس نقشبندیہ کی دو شاخیں ہیں اور منبع اس کے حضرت خواجہ عبید اللہ احرار رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ ایک شاخ تو بواسطہ حضرت محمد درویش حضرت باقی باللہ تک پہنچی ہے۔ یہ شاخ خلفائیہ ہے اور دوسری شاخ نقشبندیہ ابو العلائیہ، یہ سرسبز شاخ فرزندیہ کہلاتی ہے یعنی حضرت خواجہ محمد یحییٰ فرزند کلاں خواجہ عبید اللہ احرار کے ہیں اور خلیفہ بھی ہیں اور حضرت خواجہ عبد الحق المشتہر بہ محی الدین خواجہ محمد یحییٰ کے بھتیجے ہیں اور حضرت خواجہ امیر عبد اللہ خواجہ عبد الحق کے بھانجے ہیں اور حضرت محبوب رب الارباب سیدنا امیر ابو العلا اکبر آبادی رضی اللہ عنہ حضرت امیر عبد اللہ کے بھتیجے اور داماد ہیں۔ حضرت امیر ابو العلا قدس سرہ نے اس طریقہ عالیہ میں داخل ہو کر وہ اصول ایجاد فرمائے کہ اس طریقہ کو مجموعہ کا عطر بنا دیا۔ اکثر بزرگواروں کا ارشاد ہے کہ طریقہ ابو العلائیہ میں وہ برکتیں مخفی ہیں کہ جو عرفائے محققین کو حیرت میں ڈالنے والے ہیں۔ رابطہ اگرچہ سب طریقوں میں ہے مگر اس میں خصوصیت کے ساتھ ہے۔ حضرت سیدنا رضی اللہ عنہ کو فیض روحی بطور اویسیت چند حضرات کی ارواح مبارک سے تھا جن کے اسمائے گرامی یہ ہیں: حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ، حضرات حسنین علیہما السلام، حضرت سیدنا عبد القادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت خواجہ غریب نواز معین الدین چشتی اجمیری قدس اللہ سرہ، حضرت مخدوم شاہِ دولت منیری قدس سرہ۔ جس کے قلب میں اتنی نسبتیں جمع ہوں گی اُس کی قوت نسبت اور عرفان کا کیا ٹھکانا ہے۔ میرے حضرت پیر و مرشد برحق مولانا سید شاہ محمد قاسم داناپوری ابو العلائی قدس اللہ سرہ العزیز نے آپ کے حالات میں ایک مستقل مفصل رسالہ تحریر فرمایا ہے، اس کا نام نجات قاسم ہے۔ وہ رسالہ مقام اکبر آباد محلہ نئی بستی مطبع شوکتِ شاہجہانی آگرہ میں منشی محمد عبد الغفار خاں صاحب ابو العلائی کے پاس سے مل سکتا ہے۔ جو آپ کے حالات

دیکھنے کے شائق ہوں وہ منشی صاحب موصوف سے طلب فرمائیں۔ قیمت اس کی ایک روپیہ چہار آنے مع محصول ڈاک ہیں۔ حضرت سیدنا امیر ابو العلاء رضی اللہ عنہ کی وفات نہم صفر روز سہ شنبہ ١٠٦١ہجری میں واقع ہوئی۔ مزار پاک آپ کا اکبر آباد میں ہے۔ آپ کے دو فرزند تھے، ایک حضرت امیر فیض العلا اور دوسرے حضرت امیر نور العلا۔ حضرت امیر نور العلا قدس اللہ سرہ کی اولاد میں سے صرف ایک صاحبزادہ مسمی سید عابد حسین عرف بنّے میاں الہ آباد محلہ چک میں ہیں۔ بس ان کے سوا اولاد پسری کا آپ کے کہیں نشان نہیں۔ اب آپ کے مزار مبارک پر ایک سنگ سرخ کی بارہ دری ہے، یہ اسی کا نقشہ زینت کتاب کے واسطے داخل کتاب کیا جاتا ہے۔

نقشہ



اب ہم جملہ معترضہ ختم کرتے ہیں۔ حضرت باقی باللہ صاحب کے مزار مبارک سے رخصت ہوئے اور جناب اخوند عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے مزار مبارک پر بھی فاتحہ پڑھی اور فراش خانہ کی کھڑکی سے نکل کر فتحپوری بیگم کی مسجد میں داخل ہوئے۔ یہاں میرے ایک برادرِ طریقت شیخ محمد رمضان ابو العلائی داناپوری سلمہ اللہ تعالیٰ منشی نیاز علی صاحب مہتمم مسجد فتحپوری کے پاس ٹھہرے ہوئے ہیں ان سے ملاقات ہوگئی۔ مغرب تک یہیں ٹھہرے رہے۔ منشی نیاز علی صاحب بڑے خلیق ہیں۔ بعد نماز مغرب فرود گاہ پر پہنچے۔ یہاں ساچق روانہ ہونے کے اہتمام ہو رہے ہیں۔ نواب پاٹودی کی کوٹھی سے جامع مسجد تک فٹنوں اور سیج گاڑیوں کا سلسلہ ہے اور شرفاے دہلی بنفس نفیس اہتمام میں سرگرم ہیں۔ ان میں سے بعض حضرات کے اسماے گرامی یہ ہیں: مولوی خواجہ محمد شفیع احمد صاحب منصف تلہر، حکیم محمد ظہیر الدین خاں صاحب، محمد اکرام اللہ خاں صاحب، محمد نعمت اللہ خاں صاحب رئیس دہلی۔

مولوی خواجہ محمد شفیع احمد صاحب نے مجھے ایک فٹن پر جناب شمس العلما منشی محمد ذکاء اللہ خاں صاحب بہادر کے ساتھ بٹھا دیا۔ ابھی گاڑیاں سلسلہ وار کھڑی ہیں، نوشہ کی فٹن کا انتظار ہے۔ اسی اثنا میں ایک نوجوان نہایت عمدہ عربی گھوڑے پر سوار ہمارے سامنے سے گذرا۔ یہ گھوڑا مجھے نہایت اچھا معلوم ہوا۔ منشی صاحب نے بتایا کہ یہ حکیم محمود خاں صاحب مرحوم کے چھوٹے بیٹے ہیں، مگر یہ گھوڑا اس قدر تیار ہو گیا ہے کہ اس کی عربیت کا حسن کم ہو گیا۔ عربی گھوڑے ہمیشہ متوسط الاندام رکھے جاتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ اکثر عربی گھوڑے ٹھوکر لیتے ہیں، زیادہ بھاری بدن والا گھوڑا پھر مشکل سے سنبھلتا ہے۔ لیجیے دولہا کا فٹن آگیا، ان کے ساتھ ان کے بزرگ خاندان مولوی خواجہ محمد فضل احمد خاں صاحب سابق ڈپٹی کلکٹر بیٹھے ہیں۔ اِدھر اُدھر فٹنوں اور سیج گاڑیوں کا موزوں سلسلہ ہے، جس پر سب رؤسا عالی شان جن کے اسماء گرامی یہ ہیں باشان و شوکت بیٹھے ہیں۔ دولہا کا فٹن حسب صلاحِ اکثر امرا آگے کیا گیا ہے۔ اب سلسلہ متحرک ہوا اور ساچق چلی۔

## فہرست اسمائے گرامی امراے عالیشان زاد اللہ ایمانہم آمین ثم آمین

راجہ سید باقر علی خاں صاحب رئیس پنڈراول ضلع بلند شہر، کنور عبد الغفور خاں صاحب رئیس دھرم پور ضلع بلند شہر، کنور عبد الشکور خاں صاحب رئیس دھرم پور ضلع بلند شہر، مصطفی خاں صاحب رئیس بوڑھا گاؤں ضلع علی گڑھ، غفور علی خاں صاحب رئیس دانپور ضلع بلند شہر، کنور فیاض علی خاں صاحب رئیس پھاسو ضلع بلند شہر، کنور لطف علی خاں صاحب رئیس طالب نگر ضلع علی گڑھ، کنور یوسف علی خاں صاحب رئیس مینڈھو ضلع علی گڈھ، محمد عثمان خاں صاحب رئیس خورجہ، حافظ عبد الرحیم صاحب وکیل علی گڑھ، مولوی منصور شاہ خاں صاحب وکیل علی گڑھ، مولوی رفیع الدین صاحب وکیل علی گڑھ، محمد نور خاں صاحب وکیل علی گڑھ، نور الدین احمد خاں صاحب وکیل علی گڑھ، مولوی عباس حسین صاحب پروفیسر مدرسۃ العلوم علی گڑھ، نواب محسن الملک نواب مولوی مہدی علی خاں صاحب بہادر، مرزا محمود بیگ صاحب رئیس دہلی ڈپٹی کلکٹر ضلع بستی، سید عبد الرؤوف صاحب بیرسٹر، محمد رؤوف صاحب بیرسٹر، مولوی عبد الرشید صاحب بیرسٹر، محمد فاروق صاحب رئیس محمد آباد ضلع اعظم گڈھ، سید اولاد علی رئیس علی گڑھ، صاحبزادہ محمد احمد صاحب رئیس دہلی، محمد عالم صاحب رئیس، خواجہ یعقوب صاحب رئیس علی گڑھ، سید محمد میر صاحب وکیل میرٹھ رئیس دہلی، محمد عنایت اللہ خاں صاحب رئیس علی گڑھ، میر ثامن علی صاحب رئیس سلون، شاہ محمد ظہور صاحب اسسٹنٹ منیجر کورٹ افواروس راے بریلی ملک اودھ، مولوی ولی اللہ صاحب آنریری مجسٹریٹ راے بریلی، شاہ محمد ثناء الحق صاحب منصرم عدالت دلمو، خضر محمد خاں صاحب ڈپٹی کلکٹر و رئیس خورجہ، خواجہ محمد اسماعیل صاحب وکیل علی گڑھ مع صاحبزادہ کنور لیکھ راج سنگھ رئیس گوہانہ ضلع علی گڑھ، لالہ باس دیو سہاے رئیس سکندرہ ضلع علی گڑھ، کنور اکرام علی خاں صاحب رئیس پھاسو ضلع بلند شہر، کنور سید جعفر علی خاں صاحب پنڈراول ضلع بلند شہر مع صاحبزادگان، حاجی یوسف خاں صاحب رئیس دتاولی ضلع علی گڑھ، یونس خاں صاحب رئیس دتاولی ضلع علی گڑھ، مولوی حبیب الرحمن خاں صاحب رئیس بھیکم پور ضلع علی گڑھ، محمد خلیل خاں صاحب رئیس بھیکم پور ضلع علی گڑھ، نواب عبد السلام خاں صاحب سب جج

اناؤ ملک اودھ، ممتاز علی خاں صاحب رئیس قدیم میرٹھ وحال اٹاوہ، خواجہ محمد یوسف صاحب وکیل علی گڑھ مع صاحبزادگان، خواجہ محمد حسین صاحب رئیس علی گڑھ، سید عاشق علی صاحب رئیس جلالی ضلع علی گڑھ، محمد اکرام علی خاں صاحب رئیس علی گڑھ، میر رضا علی صاحب سابق محافظ دفتر علی گڑھ، سید سرفراز علی صاحب مختار علی گڑھ، محمد سرفراز خاں صاحب وکیل علی گڈھ، شیخ مقبول احمد صاحب رئیس مارہرہ، شیخ امین الدین صاحب سوداگر علی گڈھ، سید اعجاز حسین صاحب وکیل علی گڑھ، خواجہ عبد العلی صاحب وکیل علی گڑھ، شیخ غازی الدین صاحب رئیس ضلع علی گڑھ، شاہ امین الدین صاحب قیصر سجادہ نشین دائرہ شہر الہ آباد، محمد سعید خاں صاحب رئیس مراد آباد مع صاحبزادگان، صاحبزادہ محمد علیم خاں صاحب مدار المہام ٹونک، مولوی محمد اصغر صاحب سیشن جج رامپور، دوست محمد خاں صاحب رئیس خورجہ سابق انسپکٹر، نواب محمد علی خاں صاحب فرزند نواب مصطفی خاں صاحب شیفتہ مرحوم رئیس جہانگیر آباد، چودھری محمد سمیع الدین خاں صاحب رئیس سکندرہ راؤ، کنور مان سنگھ صاحب رئیس لکھنؤ ضلع علی گڑھ، شمس العلما مولوی محمد ذکاء اللہ خان بہادر، محمد اکرام اللہ خاں صاحب سب رجسٹرار ورئیس دہلی، مولوی سلیم الدین خاں صاحب رئیس دہلی، مولوی مراد الدین خاں صاحب رئیس دہلی، حکیم محمد ظہیر الدین خاں صاحب آنریری مجسٹریٹ ورئیس دہلی، حکیم رضی الدین خاں صاحب رئیس دہلی، ڈپٹی الٰہی بخش صاحب رئیس دہلی، بھیا شمشیر خاں صاحب برگیڈ میجر فوج رئیس گوالیار، سید محمد شیر خاں صاحب سابق نائب تعلقہ دار گلبرگہ رئیس دہلی، میر سید احمد صاحب عرف ناظر حسین رئیس دہلی، نعمت اللہ خاں صاحب رئیس دہلی، محمد عنایت اللہ خاں صاحب بی اے فرزند شمس العلما مولوی محمد ذکاء اللہ خاں صاحب بہادر رئیس دہلی، مولوی محمد شفیع احمد خاں صاحب ایم اے منصف تلہر ضلع شاہجہانپور رئیس دہلی۔

رات کا سہانا وقت ہے، تاروں کی چھاؤں میں آہستہ آہستہ فٹنوں کا سلسلہ قطار در قطار رواں ہے۔

جامع مسجد کی طرف سے چوڑی والوں کے محلہ میں جناب آغا مرزا صاحب المخاطب بہ سرور جنگ بہادر سکریٹری حضور پر نور سلطان دکن خلد اللہ ملکہ کی دولت سرا کو جاتے ہیں (اللہ شانہ مبارک فرمائے آمین)

بازار کے دکان دار اور راہ رو بڑی حیرت کی نگاہوں سے اس مبارک مجمع کو دیکھ رہے ہیں اور آپس میں کہتے جاتے ہیں کہ براتیں تو بہت دیکھنے میں آئی ہیں مگر اس شان کی برات آج تک نہیں دیکھی۔ میرے اندازے میں ایک گھنٹے میں یہ ساچق نواب سرور جنگ بہادر کے مکان تک پہنچی۔ اس مکان کے مہتمم نہایت نیک باطن اور خوش سلیقہ ہیں۔ افسوس کہ میں ان لوگوں کے ناموں سے واقف نہیں۔ شیشے کی خوبصورت تشتریوں میں بُن اور چکنی ڈلی اور الائچی وغیرہ کی تقسیم ہوئی۔ اگرچہ نواب سرور جنگ بہادر بہ نفس نفیس موجود نہیں ہیں، مگر انتظام برات کا نہایت دریادلی سے ہو رہا ہے۔ جو یہ انتظام دیکھتا ہے وہ اس شادی کا تخمینہ بہت زیادہ کرتا ہے۔ مولوی محمد سمیع اللہ خاں صاحب بہادر اور جملہ برادری کے لوگ اس شادی سے بہت خوش ہیں، فریقین میں سے کوئی کسی امر کا شاکی نہیں اور عمدہ نتیجہ شادی کا یہی ہے۔ ہر چند یہ مکان بہت بڑا ہے مگر اس قدر مجمع ہے کہ زانو بدلنے کی جگہ مشکل سے ملتی ہے۔ بہت خوبصورت مجمع ہے، اُمرا اور مہذب لوگ اس کثرت سے واقعی کسی شادی میں کم جمع ہوئے ہوں گے۔ دور دور کے مہمان آئے ہوئے ہیں۔ ہندوستان میں کیا مبارک یہ مجمع ہے کہ جس میں اتنے خوش حال مہمان نظر آرہے ہیں ورنہ جہاں دیکھیے بیچارے مسلمان افلاس میں مبتلا ہیں۔

جب ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ بلاے افلاس مسلمانوں کے سر سے کبھی ٹلے گی بھی یا نہیں، تو سانس سینے میں تنگی کرنے لگتی ہے اور باسباب ظاہر کوئی سامان نظر نہیں آتا۔ مگر ہاں ہمارے مسلمان والیان ملک اگر اس طرف توجہ کریں تو یہ مشکل آسان ہو سکتی ہے اور اس کی صورت میرے خیال میں یہ آتی ہے کہ ہر سال چند لڑکے جو ایف اے پاس کر چکے ہوں وہ امریکہ بھیج دیے جائیں تا کہ مکتب فنون میں چند سال رہ کر پاس کریں اور پھر ہندوستان میں آکر مکتبِ فن کھولیں۔ اہل امریکہ کو تعلیم فنون میں ہرگز بخل نہیں ہے، اہل انگلستان اور علوم میں بے شک سخی ہیں مگر تعلیم فنون میں بالکل بخیل۔ اگر ہمارے ہندوستان کے چند نوجوان امریکہ سے علم جرِّ اثقال و دیگر فنون کی تعلیم پاکر آجائیں تو ان شاء اللہ تعالی چند ہی سال میں ہندوستان کی بگڑی تقدیر بن جائے۔

المختصر اہلِ ساچق قریب بارہ بجے شب کے اپنی فرودگاہ پر نہایت بشاش واپس آئے اور آرام سے استراحت کی۔ صبح ہوئی، وہی معمول کے موافق معتدل گرم پانی وضو کو ملا۔ معمولات سے فرصت کی۔ اب ششم رجب کی صبح ہے۔ آج مہمانوں کو شادی کا کوئی کام نہیں ہے۔ آج تمام دن ہم ہیں اور دہلی شریف۔ اس وقت کچھ لوگ مہمانانِ برات سے اطرافِ لکھنو کے میرے پاس نہایت دردناک لفظوں میں شکایت کرتے ہوئے آئے کہ ہم حضرت مرزا جانِ جاناں رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت سے روک دیے گئے، ہر چند معذرت کی مگر اصلاً قبول نہ ہوئی۔ میں نے سنا ہے کہ یہ صاحب جو اب مجاورِ درگاہ شریف ہیں کچھ پڑھے لکھے آدمی ہیں اور حافظ بھی ہیں، معلوم نہیں کہ تلاوت کے وقت اس آیت پر بھی ان کی نظر پڑتی ہے یا نہیں: ومن أظلم ممن منع مساجد الله أن يذكر فيها اسمه الخ۔ اللہ اللہ قرآن پاک کیا جامع کتاب ہے لا رطب ولا یابس إلا في كتاب مبين۔ کون علم ہے جو قرآن پاک میں نہیں ہے: نحو، صرف، معانی، بیان، بلاغت، فصاحت، منطق، فلسفہ، طبیعیات، فلکیات، طبقات الارض، علم الابدان، نباتات، اخلاق، تصوف وغیرہم مگر افسوس یہ ہے کہ ہمیں اب تبحرِ علمی نہ رہا اور جو وہ لوگ جن کو تبحرِ علمی ہے وہ بخوبی سمجھتے ہیں اور اقرار کرتے ہیں کہ قرآن سے زیادہ مجمع علوم کوئی کتاب نہیں اور وہ دن اب قریب آگئے کہ یورپ کے حکما قرآن کی قدر کریں گے مگر ہندوستان میں تو یہ مثل جو ہم پہلے سنتے آتے تھے، ہمارے زمانہ میں اس نے ہمارے سب افراد کو گھیر لیا۔ مثل: مسلمانان در گور مسلمانی در کتاب۔ اگر ہمیں علم ہو اور ہم کلام اللہ شریف کو تدبّر کی نظر سے تلاوت کریں تو ہر جملہ کلام اللہ شریف کا ایک کسی علم کی مستقل کتاب نظر آئے۔ انگریزی کا ایسا دور ہوا کہ ہم اپنے علوم سے بالکل عاری ہو گئے۔ میں ان بعض متعصب لوگوں کی طرح سے زبان انگریزی کا مخالف نہیں ہوں جو اس کے حاصل کرنے کو کفر کہتے ہیں مگر یہ تو ضرور کہوں گا کہ اس زبان کے شیوع نے ہماری قوم کی قوم کو علم دین سے پورا جاہل کر دیا اور یہی جہالت اگر اپنے حال پر رہے گی تو رفتہ رفتہ یہ ایسی ترقی کرے گی کہ ہماری آنی والی نسلیں علمِ توحید اور رسالت سے بالکل بے خبر ہو جائیں گی۔ یہ امر اگر ہم کو نہیں تو ہمارے آنے والے جانشینوں کو ضرور کافر بنا دے گا۔ یہ امر میں اس قیاس سے کہتا ہوں کہ جو اِس وقت

انگریزی زبان میں اول درجہ کے تعلیم یافتہ ہیں، ان سے بعض ضروری مسائل وضو یا نماز کے پوچھے گر وہ جواب دے دیں تو میں اپنے دعوے سے دست بردار ہوتا ہوں۔ پس اِن کے کچھ زمانے کے بعد جو قیدِ مذہب اب برائے نام باقی ہے اس سے بھی نکل جائیں گے اِناللہ واِنا اِلیہ راجعون۔

کون ہے بعد فنا ہو گا جسے غم اپنا
ابھی ہم زندہ ہیں کر لیتے ہیں ماتم اپنا

یا اللہ! ہمارے فرمانروایانِ اسلام کے دلوں کو تعلیم مذہب کے نورانی خیال سے روشن کر والا نہ یہ کشتی اسلام جو گرداب حوادث میں پڑ کر چک پھیریاں کھا رہی ہے اب ڈوبی اب ڈوبی۔

## قطعۂ فقیر محمد اکبر ابوالعلائی داناپوری غفراللہ ذنوبہ مسمی بہ کشتیِ اسلام

اے تر و خشک کے مالک میرے پیارے اللہ! — بن کے جو بگڑی ہو اُس قوم کی بگڑی کو بنا
ناخدا قوم کی کشتی کے خدایا فریاد — کون ہے تیرے سوا دوسرا سننے والا
کیسے منجدھار سے نکلے گی یہ ٹوٹی ہوئی ناؤ — نہ تو ڈانڈ اس میں نہ پتوار نہ کھیون ہارا
نہیں معلوم کدھر اس کو ہوا لے جائے — اب کنارے سے لگا جلد یہ بہتا بیڑا
پاٹ دریا کا وہ چوڑا ہے کہ بس تیری پناہ — سیکڑوں کوس نہیں جس کے کنارے کا پتا
دھار کے توڑ سے گُن ٹوٹ گئے ہمت کے — ہیبتِ شورِ تلاطم سے ہے پانی پتا
موجیں ہیں سر بفلک کھول رہا ہے پانی — لڑ رہا ہے اسدِ چرخ سے ٹکر مینڈھا
رات اس درجہ سیہ ہے کہ شبِ ہجر سفید — رنگ پانی کا یہ تیرہ کہ اندھیرا اوجلا
ہر طرف پڑتی ہے کس زور کی چادر ہیہات — تیرنے والا ذرا بھی کہیں اولجھا کہ گیا
پڑ رہے ہیں بھنور ایسے کہ نہ دیکھے نہ سنے — جن کے چکرانے سے چکر میں ہے سارا دریا
کس بلا کی ہے مروڑ ان میں الٰہی توبہ — تنکا سو ٹکڑے ہوا کھنچ کر اگر آ پہنچا

اللہ اللہ رے اے بادِ مخالف! ترا زور — ٹوٹا اس طرح سے مستول کہ جیسے تِنکا
رسیّاں ہو گئیں اس طرح سے ٹکڑے ٹکڑے — توڑ ڈالے کوئی جس طرح سے کچا دھاگا
ڈانڈ ہاتھوں سے جو نکلا تو نہ آیا پھر ہاتھ — دھجیاں اوڑ گئیں پردوں کی طمانچہ جو پڑا
دفعتاً کھا گئی پھرکی کی طرح چکر ناؤ — پے بہ پے موج کی آمد سے جو لنگر ٹوٹا
کشتی کو موجِ تلاطم نے جو الٹا اک بار — ہو گیا کوئی تہِ آب کوئی کچھ تیرا
شور سا شور ہے دریا میں کہ خالق کی پناہ — کوئی سنتا ہی نہیں ڈوبنے والوں کی صدا
کوئی موجوں کے طمانچوں سے ہے بے ہوش کہیں — شانے شل ہو گئے ہیں پاؤں نہیں ہل سکتا
غوطے کھاتا ہے کوئی ڈوبنے کی حالت ہے — کوئی تنکے کا سہارا ہی غنیمت سمجھا
جوڑیاں زانو سے نکلیں، ہوئے بے قابو پاؤں — کاٹنا پانی کا مشکل ہے کہ بازو ہے تھکا
کون لے کس کی خبر، کس کو سنبھالے کوئی — ہو گیا ہے اسے اوچّھو تو دم اس کا ہے چڑھا
کوئی تیرے گا تو کیا اس میں اوترنا ہے محال — حوصلے پست ہیں استادوں کے شاگرد ہیں کیا
بھائی خود دیکھتا ہے ڈوب رہا ہے بھائی — پاؤں دریا میں دھرے کون نہیں ہوش بجا
نوجوان بیٹا ہے کھاتا ہے پیا پے غوطے — پدر انگشت بدنداں لبِ ساحل ہے کھڑا
ڈوبنے والوں کی گھبرائی ہوئی آوازیں — تیرنے والوں کا اوکھڑا ہوا دم ہوش خطا
نہ مُعلِم ہی کو ہے ہوش نہ ملاحوں کو — دوڑتے پھرتے ہیں سب، رنگ ہے چہروں کا اُوڑا
ایک کو ایک کی حالت سے نہیں آگاہی — اپنی اپنی ہے پڑی اپنا پرایا کیسا
سارے دریا میں اب اک یاس کا سنّاٹا ہے — تیرنے والوں کا غل کیسا کہاں چیکارا
تختے کشتی کے جدا ہو کے بہے جاتے ہیں — مال سب ڈوب گیا کوئی بھی باقی نہ رہا
کچھ خبر ہے تجھے اے قوم! یہ کشتی کیا تھی — تھا یہ جمعیت قومی کا مبارک بیڑا
علما اس کے تھے ملاح، معلم تھا امام — تھا جنھیں قوم کی کشتی کا چلانا آتا

لنگر اوس بیڑے کا تھا علم، تو پردے تھے عمل
اور مستول عَلَم دین محمد کا تھا

صدق کہتے ہیں جسے تھا وہ اُسی کا سُکان
ڈانڈ تھے ہمتِ مردانِ مبارک سیما

صفتِ عدل تھی کمپاس اسی کشتی کی
جس نے گمراہی سے بیڑے کو برابر روکا

گُن جسے کہتے ہیں، تھی حبلِ متین اسلام
اس نے کشتی کو ہر اک طرح سلامت رکھا

بحر کہتے ہیں اسی عالم ہستی کو ہم
خواہشیں نفس کی موجیں ہیں نہیں فرق اصلا

یک بیک اوٹھا جو اس بحر میں طوفانِ نفاق
دیکھتے دیکھتے بس قوم کا نقشہ بگڑا

یک دلی کی جو وہ کشتی تھی ہوئی طوفانی
اختلافات کے جھوکوں نے جو لنگر توڑا

کھا گیا ایک ہی دم میں یہ زمانہ چکر
سیدھا اولٹا ہوا اور ہو گیا اولٹا سیدھا

جوش پر آگیا اس درجہ یہ طوفانِ نفاق
ابر اِدبار کا ساون کی طرح سے برسا

کچھ نہیں سوجھتا کیوں کر نہ ہو یہ ناؤ تباہ
ہر طرف جہل کا دنیا میں اندھیرا چھایا

نہ رہی روشنی علم و عمل دنیا میں
کفر والحاد کی تاریکیوں کا دور آیا

صورتیں مسخ ہوئیں قوم کے بگڑے اخلاق
آدمی سے ہوئے حیوان کی صورت بخدا

جو فضائل تھے حمیدہ وہ تو باقی نہ رہے
اون کی جا پر متمکن ہیں ذمائم صدہا

پہلے تھی مثل زمین یہ متواضع سب سے
لے اوڑی آج فلک پر اسے نخوت کی ہوا

ہاے اس قوم کا تھا جوہر ذاتی کبھی حلم
اور اب قہر سے آتش کا بنی پرکالہ

آج یہ بخل کی فہرست میں ہے پہلی مد
کل اسے کہتے تھے سر دفتر ارباب سخا

آج اس میں نہ رہا ضبط کا یارا مطلق
انبیا کا سا تحمل کبھی اس قوم میں تھا

کل قناعت کو تھا اس قوم سے اک فخر عظیم
حرص اور آز کو اب وِرد ہوا نام اس کا

کلمہ پڑھتے تھے اس قوم کا کل اہل ہمم
یا ہے آج اس کی دنائت کا جہاں میں شہرا

حق تو یہ ہے کہ نہ تھا اس سا کوئی شکر گزار
شاد غربت میں مصیبت میں اسے خوش پایا

مگر اس عہد میں کچھ اور ہے حالت اس کی — مال بھی پاس ہے اوس پر بھی ہے غربت کا گلا
پہلے مشہور تھی مہمان نوازی اس کی — اوس کی ضد کے لیے ہے آج یہ انگشت نما
دوسری قوم کے اخلاق جو سیکھے اس نے — اپنے اوصاف جو تھے ہو گئے سب اس سے جدا
دل کو اکبار عبادت سے ہوئی نفرت — جیسے مکتب سے توحش کرے ننھا بچا
اس کے بطلان پہ ہونے لگے دعوے قائم — سب نے مل کر اسے بے سود عمل ٹھہرایا
ان نمازوں سے بھی بڑھ کر ہوئے روزے کڑوے — نام اب ان کی زبانوں پہ ہے اس کا فاقا
خمس کیا چیز ہے باقی نہ رہی جبکہ زکات — رہ گیا حج حرم، اوس کا ہے مشکل رستا
کسی سید کے لیے خمس جو کہیے تو حرام — اور چندوں کے لیے جائے جو سَر بھی تو بجا
ہائے اللہ سے کس منہ سے کریں ہم فریاد — حق تو یہ ہے کہ ندامت سے نہیں لب کھلتا
آپ کو آپ ہی ہم چاہیں بگاڑیں کہ بنائیں — آنکھ بھی عقل بھی سب کچھ تو ہمیں اوس نے دیا
ہے یہ ناحق کا بھی الزام خدا پر اکبرؔ — خود ہی بگڑیں تو بگاڑے ہمیں کیونکر نہ خدا

میں کمیت قلم کی منہ زوری اور شوخی سے سخت حیران ہوں۔ میں مرد پیر اور یہ کمال چالاک، اس کی باگ مجھ سے نہیں رک سکتی۔ کیا بیان مجھے کرنا تھا اور کہاں پہنچ گیا۔

الغرض اپنے معمولات سے فرصت کر کے اٹھنے کا تہیہ ہی کیا تھا کہ جناب مولوی صاحب بہادر نے بائیس آدمیوں کی تعداد کا ایک پاس بھیج دیا۔ بس قلعہ معلی کی سیر کی ٹھہر گئی۔ اس قلعہ کی بنیاد ۱۰۴۸ھ ہجری مطابق ۱۶۲۸ء میں رکھی گئی۔ ایک کرور روپیہ کے صرف سے دس برس میں ایک ہشت پہلو پھول کے نقشے پر سنگ سرخ کا تیار ہوا ہے۔ ۱۰۵۸ھ ہجری میں بادشاہ ہوادار آبی پر سوار ہو کر دریاے جمن کے کنارے والے دروازے سے اس میں داخل ہوئے۔ یہ وہی قلعہ ہے کہ جہاں اردوے معلیٰ نے اکبر آباد سے آکر شباب کی کیفیت پیدا کی ہے۔ اس سادہ مزاج معشوقہ نے جب اکبر آباد کو دعاے خیر باد دی ہے تو ایک عمدہ سفید وصاف پوشاک میں تھی مگر دہلی کے قلعہ معلیٰ میں پہنچتے ہی فصاحت وبلاغت کے جواہر نگار زیورات

میں لد گئی اور اپنے پورے شباب پر آکر ایک عالم کو اپنے شمعِ جمال کا پروانہ بنالیا۔ جب دہلی کی بہار خزاں ہوئی تو اس کے عمر کا چمن بھی شادابی کی رنگت بدلنے کے قریب ہوا۔ جو اس فن کے اہل کمال تھے وہ دہلی سے نکل کر لکھنؤ پہنچے۔ آخر کو آتش مرحوم کے ساتھ زندہ در گور ہو گئی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

یہ وہی قلعہ معلیٰ ہے جہاں آج ہم چند آدمی جن کے نام نامی زیب حاشیہ[۵] سفر نامہ ہیں۔ اس کے در و دیوار کو حسرت کی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اب ہم دہلی دروازے سے قلعہ معلیٰ میں داخل ہوتے ہیں۔ دروازہ اہل حسرت و یاس کی آنکھ بن کر ہم کو دیکھ رہا ہے اور ہم حیرت کی نگاہوں سے اسے تک رہے ہیں۔ دیواروں کے سرخ پتھر شہیدوں کی طرح خونیں کفن نظر آتے ہیں۔ ہم میں سے اکثر چشم نم ہیں اور رومالوں سے آنسو پوچھ رہے ہیں۔ جس سڑک پر ہم چل رہے ہیں، اس سے کچھ ایسی بوے محبت آتی ہے کہ لپٹ لپٹ کر رونے کو دل چاہتا ہے اور وہ کچھ اس طرح سے پیروں سے لپٹی جاتی ہے کہ قدم دشواری سے اٹھتے ہیں، ہوا سے خاک جو اڑتی ہے تو ہم میں سے ایک آدھ آدمی ایسے ہیں جو اپنی آنکھیں بالقصد کھول دیتے ہیں کہ کچھ دیر تک تو یہ کحل الجواہر آنکھوں میں رہے۔ اور جگہ کا غبار آنکھوں کو برا معلوم ہوتا ہے مگر اس غبار سے آنکھوں میں ٹھنڈک پڑتی ہے۔ افسوس ایک وہ زمانہ تھا کہ ہم نے اسے حضرت ابو ظفر رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ میں دیکھا تھا یا آج اِس کو اس حالت پر دیکھ رہے ہیں۔

وہ کیا گئے کہ بس اس گھر کی لے گئے رونق
بدل گئے در و دیوار وہ مکان نہ رہا

وہ شاہزادوں کے دیوان خانے، وہ بیگماتوں کی اونچی اونچی پردہ دار حویلیاں کہاں گئیں۔ لمولفہ

لے گیا رضوان یہاں کے قصر زینت کے لیے
کیا انھیں شاہوں نے بنوایا تھا جنت کے لیے

۵۔ شاہ امین الدین قیصر الہ آبادی، سید نصیر الدین صاحب دہلوی، سید اعجاز حسین دہلوی، شاہ ثامن علی صاحب سلونی، شاہ محمد ظہور بریلوی، مولوی ولی اللہ صاحب رائے بریلوی، شاہ محمد رمضان ابوالعلائی داناپوری

اللہ اللہ اس قلعۂ معلی نے اپنی اجڑی حالت دکھا کر ہمارے مجمع کو صفِ ماتم میں بٹھا دیا۔ کوئی آنکھ ایسی نہیں کہ جو تر نہ ہوگئی ہو اور کوئی دل ایسا نہیں کہ جو بھر نہ آیا ہو۔

اشک امنڈا ہوا اب ضبط سے کم رکتا ہے
محتسب اوٹھ میرے پہلو سے کہ دم رکتا ہے

چند ساعت کے لیے اپنے مجمع سے جدا ہوئے اور خوب دل کھول کر رو لیے۔ لمولفہ۔

جب رو لیے تو دھل گئی گردِ ملال سب
ہوتی ہے خوب آنسوؤں سے شست و شوے دل

ہر گریہ کا یہ دستور ہے کہ رونے سے فی الجملہ تسکینِ قلب ہو جاتی ہے مگر یہاں پر رنج و غم باوجودِ گریہ اپنی حالت پر ہیں۔ واقعی اس عالمِ ایجاد کا یہ پرانا اصول ہے کہ جو چیز یہاں بنتی ہے وہ بگڑنے کے لیے بنتی ہے اور جو شے بگڑتی ہے وہ یقیناً کچھ بننے کے لیے بگڑتی ہے۔

بنوش بادہ کہ ایامِ غم نخواہد ماند
چنان نماند چنین نیز ہم نخواہد ماند

اب اس قلعہ معلیٰ میں شاہی عمارتوں سے صرف چار پانچ مکان باقی ہیں اور سب کھود کھاد کر میدان کر دیا ہے۔ اب ہماری آنکھوں کے سامنے حضرت شاہجہاں بادشاہ رحمۃ اللہ علیہ کا دربارِ عام ہے۔ یہ وہ مکان ہے کہ جہاں بڑے بڑے والیانِ ملک سلام کو حاضر ہوتے تھے اور آج ہم سے کم رتبہ آدمی یہاں جوتیاں پہنے پھرتے ہیں ع

فھذا عجیب عجیب عجیب

اس مکان کی عظمت کوئی حضرت آصف جاہ میر محبوب علی سلطان دکن خلد اللہ ملکہ و طال اللہ عمرہ و زاد اللہ ایمانہ سے پوچھے کہ وہ اس کو کن آنکھوں سے دیکھتے ہوں گے۔ افسوس ہزار افسوس کہ ہم نے اس

لاجواب مکان کو ایک لوہے کے جنگلے سے گھرا ہوا پایا۔ سبحان اللہ! کیسا عمدہ مکان ہے اور اس کی کیا قدر کی گئی ہے۔ اس میں تمام سچے نگینے جڑے ہوئے ہیں۔ افسوس کہ قریب سے دیکھنے کا موقع نہ ملا۔ قطعہ نظیر اکبر آبادی۔

یہ جواہر خانۂ دنیا جو ہے با آب و تاب — اہلِ صورت کا ہے دریا اہلِ معنی کا سراب
وہ مطلّا شہ نشینیں وہ مذہّب بام و در — وہ مرصع خواب گاہیں بہرِ عیش و بہرِ خواب
اون میں تھے وہ صاحب ثروت جنھیں کہتی تھی خلق — کیقباد و قیصر و کیخسرو و افراسیاب
یا تو وہ ہنگامۂ تنشیط تھا یا دفعتاً — کر دیا ایسا کچھ اس دورِ فلک نے انقلاب
جس جگہ وہ مجمعِ عالی تھا وہاں اب ہے تو کیا — نقشِ سُمِّ گور یا کہنہ کوئی پر عقاب
ہیں جو دو خشتیں بہم تو دو لب افسوس ہیں — اور جو کوئی طاق ہے تو صورتِ چشمِ پر آب
خواب کہیے اس تماشے کو نظیرؔ اب یا خیال — کچھ کہا جاتا نہیں واللہ اعلم بالصواب

اس دربارِ عام کی قطع نہایت دلچسپ ہے۔ اکبر آباد کا دربارِ عام سیدھی سادی قطع کی ایک سہ دری ہے، مگر پچی کاری کا کام بہت عمدہ ہے۔ اس دربار عام میں پرندوں کی شکلیں نہایت عمدہ صنعت سے بنائی ہیں۔ ان کا دیکھنے والا سمجھتا ہے کہ یہ جانور اب شاخ پر سے اڑ چلا اور بعض پرند ایسے اطمینان سے شاخ پر بیٹھے ہیں کہ حالتِ اطمینان ان کی صورت سے ظاہر ہوتی ہے۔ پھر جو جانور رنگین ہیں ان کے پروں پر رنگ آمیزی نہیں ہے بلکہ عمدہ پتھر کے نگینے جڑے ہیں۔ کچھ پرند ایسے بنائے ہیں کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہوا سے ابھی اڑتے ہوئے آئے ہیں، ہنوز بازو اچھی طرح سے سمٹنے نہیں پائے ہیں۔ بعض طائر اپنی منقاروں کو کھولے ہوئے چہچہے کر رہے ہیں۔ ان کی تصویر بجنسہ ویسی ہی کھنچی ہے۔ اگرچہ یہ ہم کو مرغ تصویر نظر آتے ہیں مگر ان کی نادر و نازک صنعت ان کی آوازیں اس وقت تک ہمارے کانوں میں پہنچا رہی ہے۔ کسی جگہ انگور کی تاک بنائی ہے وہ صنعت بھی قابل ملاحظہ ہے۔ اگر اس کے خوشے کسی ترکیب سے آدمی کے سامنے رکھ

دیے جائیں تو وہ فوراً اس کے لیے ہاتھ بڑھا دے گا۔ یہاں مجھ کو حضرت مولانا نظامی کا ایک شعر یاد آگیا اور اس نے وہ لطف قلب میں پیدا کر دیا کہ یہ ساری صنعتیں بے کار نظر آنے لگیں۔

ہمہ اندرزِ من بتو این است
کہ تو طفلی و خانہ رنگین است

مگر فوراً ہی کسی نے آکر گوش دل میں یہ کہہ دیا کہ یہ جتنی صنعتیں ہیں سب آئینے ہیں اور وہ آپ اس آئینہ میں اپنا نظارہ کر رہا ہے۔ غزل۔

دیکھیں خوش ہو کے نہ کیوں آپ تماشا اپنا | آئینہ اپنا ہے عکس اپنا ہے جلوا اپنا
کس نے دکھلا دیا وہ چاند سا مکھڑا اپنا | اور سے اور نظر آتا ہے نقشا اپنا
آئینہ سامنے رکھا ہے، وہ ہیں محوِ جمال | کر رہے ہیں مری آنکھوں سے تماشا اپنا
ہم کو کس طرح سے دیدار کا موقع ہاتھ آئے | وہ خود آئینہ میں کرتے ہیں تماشا اپنا
وصل کا اب نہ رہا کوئی سہارا باقی | زندگی تو نے بھی ساتھ آج سے چھوڑا اپنا
ہوئی جاتی ہے ابھی مجلس ہستی برخاست | حصہ سب لے کے چلے جائیں گے اپنا اپنا
جمع کر رکھے ہیں سب آپ کے پیکان میں نے | آپ فرمائیں تو دکھلاؤں کلیجا اپنا
آپ نے غیر کو تاکا تھا اِدھر آیا تیر | آپ چوکے یہ نشانہ نہیں چوکا اپنا
طور پر آئینہ چمکانے سے یہ مطلب تھا | پہلے منہ دیکھ لیں آئینہ میں موسا اپنا
کہہ دو دنیا سے کہ رندوں سے الگ ہٹ کے مرے | کسی زاہد سے یہ اوٹھوائے جنازا اپنا
خاکساروں کو غم اس کا نہیں اصلاً اکبرؔ | رنگ بدلا نہ کرے روز زمانا اپنا

فقیروں کی دھن ہی تو ہے، ابھی کیا الاپ رہے تھے ابھی غزل پڑھنے لگے۔ باز آمدم بر سر مطلب؛

اس دربارِ عام کی صنعت اور نقاشیوں نے ایسا محو کر دیا کہ آنکھیں صانع کے جمال پر جا پڑیں۔ اللہ اللہ یہ

آنکھیں بھی کیا نعمت ہیں کہ ہم کو کیسے کیسے خوبصورت اور دلچسپ ذریعوں سے ہمارے مالک کی طرف کھینچ کرلے جاتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مشاہدۂ قدرت کے لیے آنکھوں سے بڑھ کر کوئی حس نہیں۔

گوش دلّال است و چشم اہلِ وصال
چشم صاحب حال و گوش اصحابِ قال

حق تو یہ ہے کہ اِن حالتوں کے جاننے والے اہلِ حالت ہی ہوتے ہیں۔ اصحابِ قیل و قال کی آنکھیں یہاں رمد آگیں ہیں۔ اس مذاق کے بطلان میں وہ ہزار معقولی دلیلیں پیش کریں مگر اہلِ حال کب سنتے ہیں۔

علمِ معقول است علم اشقیا — علمِ نامعقول علمِ انبیا
فلسفہ کو منکر حنّانہ اند — از علوم انبیا بیگانہ اند
گر بہ استدلال کارِ دین بُدے — فخر رازی راز دارِ دین بُدے
پائے استدلالیان چوبین بود — پائے چوبین سخت بے تمکین بود

المختصر اس دربار کے دیکھنے سے ہستی و نیستی دونوں کا اندازہ ہو گیا۔ مجھے یہ حیرت ہے کہ اِن عمارات کے دیکھنے کے بعد آدمی کیوں کر اس دنیاے دنی سے رشتۂ اتحاد قائم رکھ سکتا ہے۔ کہاں ہے آج شاہجہاں بادشاہ جس نے یہ بے مثل عمارت بنائی ہے۔ روح تو ان کی اپنے مقام میں ہو گی مگر استخوان و شرائین و عصبات وغیرہ کا تو نام بھی نہ ہو گا، بلکہ ان کی اولاد میں سے بھی شاید ہی کوئی موجود ہو، انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

اب ہم دربارِ خاص کی باشوکت و شان عمارت دیکھ رہے ہیں۔ ایک بوڑھا گورا سینے پر چند تمغے لگائے کرسی پر بیٹھا ہوا پہرا دے رہا ہے۔ یہ وہ جگہ ہے کہ بڑے بڑے والیان ملک آنکھوں سے آتے تھے، اب وہیں یہ ذات شریف اس شوکت و شان سے براج رہے ہیں۔ انقلاب اسی کا نام ہے۔ یہ دربارِ خاص سنگِ مرمر کی بہت وسیع بارہ دری ہے اور آب زر سے نقش و نگار بنے ہوئے ہیں۔ جب پشت بقبلہ تخت کے سامنے کھڑے ہو جاؤ تو اس بارہ دری کے بائیں طرف اتّر کی سمت کو بعد ایک سنگِ مرمر کے صحن کے حمام ہے اور داہنے جانب یعنی دکھن کی سمت مثمن برج ہے اور اِس سنگِ مرمر کی بارہ دری کے وسط میں دریا کی طرف

سنگِ مرمر کی خوش قطع ہشت پہلو چوکی رکھی ہے جس پر تختِ طاؤس رکھا ہوا تھا۔ اہلِ تاریخ نے لکھا ہے کہ تختِ طاؤس کا طول ۶ فٹ اور عرض ۴ فٹ کا تھا۔ اس میں ۱۰۸ قیمتی یاقوت ۱۳۵ رتی سے ۱۵۰ رتی تک کے وزن کے جڑے تھے اور سولہ زمرد ۳۶ رتی سے ۷۲ رتی تک کے تعبیہ تھے اور بہت سے درّ شہوار جڑے تھے اور موتیوں کی خوش نما جھالر تھی۔ تمام تخت پر طاؤس کی طلائی دم نہایت موزونی کے ساتھ مرصع بجواہرات سایہ افگن تھی اور عمدہ نیلموں سے مزین تھی۔ سینہ پر ایک یاقوت بہت بڑا جڑا ہوا تھا جس کی گردن میں ۳۶ رتی وزن کا ایک موتی لٹکتا تھا اور ایک سو سترہ رتی وزن کا موتیوں کا لچھا آویزاں تھا۔ چتر کے بارہ چوبوں میں گول اور خوش آب موتی جڑے تھے جن کا وزن ۶ سے ۱۲ رتی کا تھا۔ ان چوبوں کا طول آٹھ فٹ کا تھا۔ اس میں ۷ کرور دس لاکھ روپیہ صرف ہوا تھا۔ اس کی تاریخ محمد جان قدسی نے جو شاہجہاں کے پایۂ تخت کا شاعر تھا یہ کہی ہے، شعر

چو تاریخش زبان پرسید از دل

بگفت: اورنگ شاہنشاہِ عادل ۱۰۴۴ھ

اہلِ تاریخ لکھتے ہیں کہ جب یہ تخت تیار ہوا اور خداشناس شاہجہاں بادشاہ نے اس پر جلوس کیا تو پہلے دو رکعت نماز نفل شکرانہ پڑھی پھر ہاتھ اٹھا کر یہ دعا کی کہ اے پروردگار! اس ملعون فرعون کا تخت جس نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا آبنوس کی لکڑی کا تھا اور فیل دندان اس پر جابجا جڑا تھا۔ اس کمبخت نے اس پر بیٹھ کر دعوائے خدائی کیا اور میں اس تخت پر جو اس سے قیمت اور صنعت میں بدرجہا بڑھا ہوا ہے بیٹھ کر اپنے سچے دل سے اپنی بندگی اور عبودیت کا اظہار کرتا ہوں۔ اے پروردگار! تو بادشاہ حقیقی اور قادر علی الاطلاق ہے اور تیرے بندوں میں سے ایک ضعیف اور بے حقیقت بندہ ہوں۔ ہر وقت تیرے فضل و کرم کا امیدوار ہوں اور تیری بخشش کا طلب گار۔ مجھ پر رحم فرما۔ اس وقت جس قدر حاضرین دربار تھے، سب اللہ کی جناب میں سر افگندہ اور چشم پر آب تھے۔

اے مسلمانو! تمھاری قوم کے بادشاہوں کے یہ خیالات تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ بادشاہ کی نیک نیتی کا رعیت پر بڑا اثر پڑتا ہے۔ روایت: جب حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ بادشاہ ہوئے تو بعض بکریوں کے چرواہوں نے لوگوں سے پوچھا کہ یہ کونسا نیک بخت بادشاہ تخت پر بیٹھا ہے کہ جس کی نیکی کا اثر ہم تک پہنچا ہے۔ لوگوں نے پوچھا کہ وہ کیا اثر ہے جو تم تک پہنچا ہے؟ انھوں نے کہا کہ ہماری بکریوں میں بھیڑیا آجاتا ہے تو نہ اس سے بکریاں ڈرتی ہیں، نہ وہ بکریوں کو پکڑتا ہے۔ اللہ تعالی شانہ اپنے جس بندے کو کسی ملک کا بادشاہ کرے تو اس کو لازم کہ وہ اپنی عادتوں کو سنوارے کیوں کہ اس کی عادات اور اوضاع کا رعیت نقشہ اُتارے گی۔ اگر بادشاہ عابد اور متقی اور خداترس ہے تو تمام رعایا میں یہ صفت آجائے گی اور اگر خدانخواستہ باشد بادشاہ بے نماز و روزہ خوار و نشہ باز ہے تو تمام رعایا اس بلا میں مبتلا ہو جائے گی۔ یہ مسئلہ مسلمۂ اہل دین ہے کہ جملہ بندگان سے قیامت میں پہلے سوال نماز کا ہوگا اور بادشاہوں سے عدل کا۔ یا اللہ میں خاک عجز پر اپنی پیشانی کو رکھ کر تیرے حضور میں التجا کرتا ہوں کہ جہاں جہاں ہماری قوم کے مسلمان بادشاہ ہیں ان سب کو صلاح و تقوی کے لباس سے آراستہ فرما اور سب کے دلوں کو اپنے اور اپنے حبیب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی بے ریا محبت سے بھر دے آمین ثم آمین۔ روسا و اُمرا کی خدمت میں بغیر کسی امیدِ دنیاوی کے التماس ہے کہ ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان سے اللہ کے واسطے محبت رکھنے کا بہت بڑا ثواب ہے۔ بعض اہلِ قلوب نے اپنی تصنیفات میں ظاہر کیا ہے کہ ابدالانِ شام کو یہ مرتبہ جو اللہ تعالیٰ شانہ نے عطا فرمایا ہے وہ اسی وجہ سے ہے کہ وہ مسلمانوں کے بے غرض دوست ہیں۔ چنانچہ اسی معنی کی موید یہ حدیث شریف ہے۔ حدیث شریف: المتحابون فی جلالي لهم منابر من نور يغبطهم النبيون والشهداء۔ ترجمہ: یعنی جو لوگ اللہ کے واسطے آپس میں محبت رکھتے ہیں قیامت میں ان کے واسطے نور کے منبر ہوں گے جن کو دیکھ کر انبیا اور شہدا غبطہ کریں گے۔ لہٰذا ہر مسلمان کو لازم ہے کہ اپنے ہر مسلمان بھائی کا خیر خواہ ہو۔ اسی اصول کے موافق میری عرض جملہ طبقہ مسلمین کی خدمت میں ہے، خصوصاً امرا کی جناب میں اس لیے کہ ان کے افعال عام لوگوں کے دلوں پر اثر ڈالتے ہیں۔ ہر امیر کو عوام الناس کی نسبت اللہ تعالے شانہ سے

زیادہ ڈرنا چاہیے اور شکر گزار بھی زیادہ ہونا چاہیے کیونکہ ان کے مالک نے اِن کو نوازا ہے۔ ایسی حالت میں بھی شکر گزار نہ ہوں تو تعجب ہے اور ہر نعمت کا شکر جداگانہ ہے۔ اس کی شرح کے واسطے بہت وقت اور بڑی کتاب درکار ہے، العاقل تکفیہ الاِشارۃ۔ مگر ان کے واسطے سب سے زیادہ یہ امر مقدم ہے کہ اپنی اولاد کی تعلیم عمدہ طریقہ سے کریں اور اولاد پر بڑا اثر ان کے ماں باپ کے افعال کا ہوتا ہے۔ جس کا باپ نشہ باز ہوگا اُس کی اولاد کے دل میں کبھی شراب کی برائی پیدا نہ ہوگی کیونکہ وہ تو اپنے قبلہ و کعبہ کو ایسے فعل میں مبتلا دیکھ رہا ہے، اس کے واسطے تو اس کی حلت کی دلیلِ قطعی موجود ہے۔ اور جس کا باپ عورات فاحشہ سے اختلاط رکھتا ہوگا، اس کا بیٹا بھی ضرور اس فعل میں مبتلا ہوگا، اس لیے کہ گھر ہی میں اس کی تعلیم کا سلسلہ جاری ہے وَقِس علی ھذا۔ پس جس شخص کو اللہ تعالیٰ شانہ کسی قوم کا مقتدا یا کسی خاندان کا بزرگ کرے اس پر فرض ہے کہ وہ اپنے اطوار درست کرے۔ میرے حضرت پیر و مرشد برحق و والد ماجد قدس سرہ نہ پان نوش فرماتے تھے، نہ حقّہ سے شوق تھا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ جس قدر لڑکے اس وقت خاندان میں موجود ہیں شاید ان میں سے دو ایک لڑکے حقہ و پان سے شوق رکھتے ہوں ورنہ اکثر اس بلا سے بچے ہوئے ہیں۔ دل تو بہت کچھ لکھنے کو چاہتا ہے مگر نہ اتنا وقت مجھے مل سکتا ہے، نہ اب ہاتھوں میں قوت ہی رہی۔ لہٰذا مدعاے اصلی کی طرف پھرتا ہوں۔

اس دربارِ خاص کی اس سے زیادہ کیا تعریف ہو سکتی ہے جو اس کا میرِ عمارت آبِ زر سے خود اس پر لکھ گیا ہے۔

اگر فردوس بر روے زمین است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

میں اس سنگِ مرمر کی چوکی کے پاس گیا جس پر تختِ طاؤس رکھا ہوا تھا۔ میں نے بزبانِ دل اس سے ہوں کہا کہ اے شفاف سنگ مرمر کی چوکی! تو نے اپنا ایسا بیش بہا تختِ طِلا جس میں سات کرور کے جواہرات جڑے ہوئے تھے کیا مفت ضائع کر دیا اور تجھے افسوس نہ آیا۔ اس چوکی سے ایک ایسی دل آویز صدا آئی کہ جو

میرے دل ہی نے سنی اور مجھ کو از خود رفتہ کر دیا: اے بے خبر نادان! میں تو ایک جَماد ہوں جو متحرک بالارادہ نہیں۔ میری حرکت وسکون تو تیرے ہی جنس کے ہاتھ میں ہے۔ تیری جنس میں سے ایک شخص نے مجھے یہاں بچھا دیا ہے، کئی سو برس سے بچھی ہوئی ہوں، نہ کوئی اضافت تحسین کی مجھ تک آتی ہے اور نہ کوئی ضمیر نفرین کی میری طرف پھرتی ہے۔ میں تو اپنے وطنِ اصلی میں جسے تم پہاڑ کی کان کہتے ہو آرام سے پڑی تھی، تیرے جنس کے آدمی نے مجھ پر یہ ستم کیا کہ وطن اصلی سے جدا کر کے غریب الوطن بنا دیا اور اس ظلم پر دوسرا ظلم یہ کیا کہ ہزاروں تیشے بے جرم وقصور مجھ پر لگائے اور نہایت فصاحت وبلاغت سے بیان یہ کیا کہ ہم نے اس کو کیسا ہموار اور خوبصورت کر دیا ع

ہماری جان گئی آپ کی ادا ٹھہری

اپنی زینت و آرائش کے واسطے مجھے اس صورت میں تراش کر یہاں لا بچھایا اور اس پر بھی صبر نہ آیا۔ ظلم بالائے ظلم یہ کیا کہ اس پر سیکڑوں من کا بوجھ رکھ دیا اور خود جلوس کیا اور نام اس کا تختِ طاؤس رکھا۔ پس جو طاؤس کہ حقیقی اور اصلی بہشت میں رہنا نہ پسند کرے وہ دنیا کی بے حقیقت بہشت میں کب رہ سکتا تھا۔ یہاں سے بھی اس کو ایک افعی دیو سیرت اڑا لے گیا اور الحمدللہ کہ مجھ کو بارِ گراں سے سبک دوش کر گیا۔ مگر اے غافل و بے خبر! میں تجھ سے پوچھتی کہ تیرے دعوے تو زمین و آسمان سے زیادہ عریض و طویل ہیں اور کرتوت کچھ بھی نہیں۔ تو بھی تو ایک مٹّی کی چوکی ہے جس پر اخلاق انبیا علیہم السلام اور اوصاف اولیا رحم اللہ علیہم اجمعین کا تختِ جواہر نگار رکھا ہوا تھا، تو وہ کہاں چھینک آیا۔

تو بخویشتن چہ کردی کہ بما کنی نظیریؔ
بخدا کہ واجب آمد ز تو احتراز کردن

ارے نادان سخن ساز! اہل قلب کے واسطے یہ باد فروشیاں روا نہیں۔ سن میرے تخت میں تو جواہر سفلی جڑے تھے جو اہل استغنا کے نزدیک کنکر پتھر سے زیادہ قیمت کے نہ تھے وہ خاک ہو گئے ہوں گے یا صباح چند کے بعد خاک ہو جائیں گے۔ تیرے تخت میں تو جواہر علوی تھے اور تو متحرک بالارادہ بھی ہے ان کے محفوظ

رکھنے پر قادر تھا۔ تو نے کیوں انھیں ضائع ہونے دیا۔ کیا یہ مثل تجھے یاد نہیں کہ خود را فضیحت و دیگراں را نصیحت۔ تیرا اعتراض تو مجھ پر جب درست ہو تا کہ تیری حالت درست ہوتی۔ تو تو مجھ سے خود بدرجہا بدتر ہے۔

عیب است بزرگ برکشیدن خود را　　و زجملۂ خلق برگزیدن خود را
از مردمکِ دیدہ بباید آموخت　　دیدن ہمہ کس را و ندیدن خود را

اللہ اللہ

گویم بہر زبان و بہر گوش بشنوم
وین طرفہ ترکہ گوش و زبانم پدید نیست

اس جواب باصواب نے وہ اثر پیدا کیا کہ نقش دیوار بنادیا۔ بہت دیر کے بعد جو میں نے اپنی حالت کی طرف بازگشت کی تو میرے ہمراہی مجھے تنہا چھوڑ کر مثمن برج میں جا چکے تھے، جہاں میزانِ عدل ہے۔ میں بھی وہاں پہنچا۔ اس مقام کو دیکھ کر اس باخدا بادشاہ کے نیک خیال اور شان و شوکت کی تصویر آنکھوں کے سامنے آگئی جو آج سے تقریباً تین سو برس پہلے فنا ہو چکی تھی اور آنکھوں نے پیہم آنسوؤں کا تار باندھ دیا۔ ادھر میرے خیال کے وسیع اور نورانی صحن میں ایک بزرگ صورت اور ولی سیرت پیر مرد جسے شاہجہاں کہنا نازیبانہ ہوگا میرے سامنے آکر کھڑا ہو گیا اور زبان بے زبانی سے کہنے لگا کہ اے رونے والے! اللہ تجھ پر رحم کرے کیوں رو رہا ہے۔ یہ کارخانے قدرت کے ہیں، یوں ہیں بگڑتے بنتے چلے آئے ہیں۔ ہر موجود جو دائرۂ امکان میں ہے، معدوم ہونے والا ہے اور بعض معدوم جو عالم وجود میں آنے والے ہیں یہ انھیں کا تقاضا ہے کہ موجود معدوم ہوتے ہیں۔ اگر زوال و فنا سے بری ہے تو وہی ایک ذات واجب الوجود۔ ابھی تو تُو اس قلعہ ہی کے بگڑنے بننے پر رو رہا ہے۔ ایک وہ زمانہ عنقریب آنے والا ہے کہ صفحہ آسمان و زمین کاغذ کی طرح لپیٹ لیے جائیں گے، دیکھ میری طرف اور گوش حق نیوش سے یہ حدیث شریف سن: ابو ھریرۃ: یقبض

اللہ الارض یوم القیامة ویطوی السماء بیمینه ثم یقول أنا الملك أین ملوك الأرض۔ یہ خیالات جو اس وقت تیرے دل میں ہیں دنیا سے متعلق ہیں دین سے نہیں ہیں۔

غمِ دین خور کہ غم غمِ دین است
ہمہ غمہا فروتر از ایں است

همّ الدنیا ظلمة في القلب وهمّ الآخرة نور في القلب۔ مجھے بادشاہی کی حالت میں بھی اکثر دنیا فانی ہی نظر آتی تھی۔ چنانچہ اس نہر کے محراب پر دیکھ جو میرے وضو کرنے کی جگہ ہے، کون سی رباعی لکھی ہے۔ بس میں نے جو اس طرف نگاہ کی تو واقعی وہ لاجواب رباعی آب زر سے لکھی دیکھی کہ دل بے تاب ہو گیا اور فوراً اس کی نقل بیاضِ دل پر اتارلی۔ رباعی۔

اے بند بپاے و قفل بر دل ہوشدار    وے دوختہ چشم وپاے در گل ہوشدار
عزمِ سفر مغرب و رو در مشرق    اے راہ روِ پشت بمنزل ہوشدار

اس تقریر اور اس رباعی نے دل کو ایک ایسی تسکین بخشی کہ وہ فشار قلب تمام تر رفع ہو گیا۔ اسی رباعی کے اوپر میزان عدل آب زر سے بنی ہوئی ہے۔ میزان عدل کے دیکھنے سے یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ گئی کہ مسلمان بادشاہوں کے خیالات پورے پورے عدل کی طرف متوجہ تھے۔ یہ نہر ماہتاب باغ سے حمام میں آئی اور حمام سے مثمّن برج میں آئی ہے۔ نواب علی مردان خاں حصار سے اس نہر کو دہلی میں لایا تھا۔ اس مثمّن برج کے نقش و نگار و حسن عمارت دیکھنے ہی کے قابل ہیں، دائرۂ تحریر میں نہیں آسکتے۔ یہ عمارت دوازدہم ذی حجہ ۱۰۴۸ھ ہجری نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں پچاس لاکھ روپیہ کے صرف سے تیار ہوئی ہے اور اسی مثمن برج کا ایک بہت چھوٹا سا ٹکڑا دریا کی طرف کا ٹوٹ گیا تھا۔ اس کی ترمیم ۱۲۲۳ھ ہجری میں ہوئی ہے۔ یہ زمانہ اکبر ثانی کا تھا۔

اب ہماری پوری جماعت حمام کا رخ کرتی ہے۔ دربارِ خاص و صحن کا فاصلہ طے کیا اور پہنچ گئے۔ یہ مکان اپنی خوب صورتی میں مثمّن برج کا پہلو دبائے ہوئے ہے۔ نہروں کا ایر پھیر لطف دکھارہاہے۔ کپڑے

اتارنے کے کمرے اور غسل کا کمرہ اور بعد غسل کے استراحت کا کمرہ علاحدہ علاحدہ بنا ہوا ہے۔ یہاں جو سنگ مرمر پر نقش و نگار ہیں تو پتھروں کی پچی کاری کی جگہ رنگ بھرا ہے۔ یہ اور نادر صنعت ہے، رنگ پر ایسی جِلا ہے کہ بے تکلف عقیق یمنی معلوم ہو رہا ہے۔ اس رنگ کی تحقیق مجھے یوں ہوئی کہ جہاں پر کوئی بوٹا اکھڑ گیا تھا اس کا ذرا ریزہ لے کر دیکھا اور بہت غور کرنے کے بعد آخر کو وہ رنگ ہی نکلا۔ اب حمام سے باہر آئے اور موتی مسجد کا احرامِ ارادت باندھا۔ عصر کی نماز جماعت سے یہیں پڑھی۔ چونکہ میں مسافرِ مقصر تھا اور عزیزی محمد رمضان ابو العلائی داناپوری مقیم تھے، وہی امام ہوئے۔ اس مسجد میں نماز پڑھنے سے ایک عجیب حالت طاری ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔

در نمازم خمِ ابروے تو با یاد آمد
حالتے رفت کہ محراب بہ فریاد آمد

یہ مسجد اکبر آباد کی نگینہ مسجد سے شاید کچھ بڑی ہو یا برابر، حسن عمارت میں میرے خیال میں نگینہ مسجد اس سے بہتر ہے۔ سنگِ مرمر دونوں کے ایک ہی سے ہیں اور موتی مسجد اکبر آباد کی اس سے بہت بڑی ہے اور مینا مسجد اکبر آباد کی وہ اس سے بہت چھوٹی ہے۔ اب رہا اکبر آباد کا شیش محل، اس رنگ ڈھنگ کی اس قلعہ میں کوئی عمارت نہیں ہے۔ اکبر آباد کا قلعہ اس سے بڑا بھی ہے اور اس میں عمارتیں بھی زیادہ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں صرف شاہجہاں کی عمارتیں ہیں اور وہاں اکبر اور جہانگیر اور شاہجہاں تینوں بادشاہوں کے مکانات ہیں اور دہلی میں جو عمارتیں خوش قطع ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ پہلی مشق اکبر آباد میں ہوئی اور جو اصلاحیں اس میں رہ گئیں وہ یہاں ہوئیں۔ یہی حال بجنسہ زبان اردو کا ہے۔ بنیاد اس کی اکبر آباد میں پڑی اور صاف ہوئی دہلی میں اور لطف یہ ہے کہ قسمت کا زور آور لکھنؤ رہا کہ تمام شعرا اکبر آباد اور دہلی کے وہاں موجود اور نام لکھنؤ کا۔ میر، سودا، مصحفی، انشا، آتش وغیرہم سب دہلی ہی کا کلمہ پڑھتے تھے مگر خاکِ لکھنؤ نے اِن کو ایسا جواہر گراں بہا سمجھا کہ اپنے دل ہی میں رکھ چھوڑا۔ فقط ایک شیخ ناسخ البتہ ع

لکھنؤ مجھ پر فدا اور میں فداے لکھنؤ

کہا کہیے مگر وہ بھی میر ہی کا دم بھرتے رہے۔

شبہ ناسخ نہیں کچھ میر کی استادی میں
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

اور میر دہلی کے ضرور تھے، خواجہ آتش فرماتے ہیں۔

اک تختۂ ہفت کشور دہلی کا ہے ہمارے
نو آسمان ہیں اپنے اکبر کے نورتن میں

میر انیس کی نسبت جو کہا جاتا ہے کہ یہ لکھنؤ کے ہیں، یہ ایسے لکھنؤ کے باشندے ہیں جیسے کلکتہ کے کولو ٹولے میں تمام اہل دہلی آباد ہیں اور ان کے بال بچے وہاں ہوں اور کلکتہ کے بنگالی ان کی پیاری پیاری زبان سن کر جوش میں آکر کہنے لگیں کہ یہ بچے کلکتہ کے ہیں۔ میر انیس کے باپ خلیق، ان کے باپ میر حسن، ان کے باپ غلام حسین ضاحک یہ سب دہلی کے ہی تھے۔ فقط مرزا دبیر لکھنؤ کے ہو سکتے ہیں تو ان کی زبان مخفی نہیں۔ یا اللہ بات کیا تھی، جھگڑا کیا چھڑ گیا۔ اب ہم پھرتے پھرتے تھک گئے، چلنے پھرنے کی تھکن تو جسمی تھکن ہوتی ہے اور عبرت کی تھکن روحی تھکن ہے۔ طبیعت بہت کسل مند ہے۔ اب تو فرودگاہ کی طرف منہ اٹھ گیا، بڑی مشکلوں سے اللہ اللہ کر کے اتنا راستہ طے ہوا کہ گھر پہنچے۔ اب بیٹھنا دشوار ہے، خیر کسی طرح سے پلنگ پر بیٹھے اور بے تکلف ہو گئے۔ ہنوز کروٹ بھی نہ بدلی تھی کہ کھانا کھانے اور چاے پینے کے تقاضے ہونے لگے۔ جناب مولوی صاحب بہادر بالقابہ بھی تشریف لائے اور اسی وسیع اخلاق سے پیش آئے۔ الحمد للہ کہ اس سے زیادہ شکر کا مقام یہ ہے کہ اس زمانۂ پر شور کے اثر نے عزیزی مولوی محمد حمید اللہ خاں صاحب مد اللہ عمرہ پر کچھ تاثیر نہ کی۔ ویسے ہی اخلاق، ویسا ہی تقوی ہے۔ کبھی ہم نے عزیز موصوف کو چرٹ بھی پیتے نہیں دیکھا۔ حق تو یہ ہے کہ بیٹا وہی ہے جو اپنے باپ اور دادا کے اخلاق کی تصویر ہو، الولد سر لأبیه ع

نہفتہ ہاے پدر راز پسر شود پیدا

اب کھانا آگیا اور بھیا شمشیر خاں صاحب دستر خوان پر کھانا چن رہے ہیں اور ان کی ایک بہت خُرد سال بچی میرے پاس بیٹھی ہوئی اچھی اچھی باتیں کر رہی ہے۔ ہم نے کھانا خوب آسودہ ہو کر کھایا۔ ہاتھ دھونے کے وقت معلوم ہوا کہ ہمارے سامنے دالان میں جس میں ایک خوب صورت پھول دار لمپ روشن ہے جناب محمد ممتاز علی خاں صاحب رئیس قدیم میرٹھ ٹھہرے ہوئے ہیں۔ یہ میرے والد ماجد مرحوم مغفور کے بڑے دوست ہیں۔ اگرچہ میں روسا و امرا کی خدمت میں حاضری کی قابلیت نہیں رکھتا لیکن ان سے حضرتِ والد ماجد قدس سرہ کی خصوصیت کے سبب سے ملاقات ضروری سمجھتا ہوں۔ کامل دو گھنٹے ان کی خدمت میں حاضر رہا۔ اب یہ تمام تر نور ہو گئے ہیں۔ سفید ریش، گورا رنگ، اس پر پیری کا انحنا[۶] عجب نور کا عالم دکھا رہا ہے۔ بیاسی برس کی عمر ہے، تہجد ناغہ نہیں ہوتی، آنکھیں ہر وقت پر نم، زندگی اس کا نام ہے۔ گو یہاں سے اٹھنے کو دل نہیں چاہتا، مگر کل کے لیے آج آرام کر لینا ضرور ہے۔

اب ساتویں رجب روز دوشنبہ ۱۳۱۱ھ مطابق ۱۵/ جنوری ۱۸۹۴ء کی صبح ہے اور یہی دن نکاح کا قرار پایا ہے۔ بڑے بڑے اراکینِ شہر اہتمام میں مصروف ہیں۔ جن کو میں پہچانتا ہوں، یہ ان کے اسمائے گرامی ہیں: محمد اکرام اللہ خاں صاحب رجسٹرار و رئیس دہلی، حکیم ظہیر الدین احمد خاں صاحب آنریری مجسٹریٹ و رئیس دہلی، حکیم رضی الدین احمد خاں صاحب رئیس دہلی و نعمت اللہ خاں صاحب رئیس دہلی، مولوی خواجہ محمد شفیع احمد خاں صاحب ایم اے منصف تلہر رئیس دہلی، مولوی خواجہ محمد یوسف صاحب وکیل ہائی کورٹ رئیس علی گڑھ، خواجہ محمد اسماعیل صاحب رئیس علی گڑھ، مولوی محمد مراد الدین خاں صاحب رئیس دہلی، سید محمد میر صاحب وکیل میرٹھ رئیس دہلی، اور لوگوں کے نام نہیں معلوم۔ ایک بہت بڑا سلسلہ فٹنوں اور سیج گاڑیوں کا کھڑا ہوا نظر آتا ہے۔ مہتمم مہمانوں کو سوار کرا رہے ہیں، تھوڑی دیر کے بعد نوشاہ محمد حمید اللہ خاں خلعت نوشاہی سے یوں آراستہ ہو کر مکان سے باہر آئے کہ ایک عربی مدنی وضع کی عبا جو خاص مکہ معظمہ کی بنی ہوئی تھی، ایک سفید شامی کپڑے کا عمامہ زیب سر، عمدہ سبزے گھوڑے پر سوار اور چاروں طرف

---

۶۔ انحنا بمعنیٰ بڑھاپے کی خمیدگی

خاندان کے بزرگ پیدل۔ بس جس قدر امرا اور روسا تھے جناب مولوی صاحب کو پیدل دیکھ کر سبھوں نے اپنی اپنی سواریاں چھوڑ دیں، ہر چند مولوی صاحب نے معذرت کی مگر کسی نے قبول نہ کی اور بیرم خاں کے تراہے سے باشان و شوکت جامع مسجد ہوتے ہوئے برات چوڑی والوں کے محلہ میں نواب آغا مرزا المخاطب بہ سرور جنگ بہادر کے مکان کی طرف روانہ ہوئی۔ یہ فاصلہ ایک میل سے زیادہ ہے، مگر سب کے سب نہایت مسرور تھے۔ ساچق کے روز سے اس میں زیادہ لطف تھا۔ تھوڑی دیر میں برات مقام مقصود پر پہنچ گئی اور الحمدللہ کہ نکاح ہو گیا۔ خطبہ خود جناب مولوی محمد سمیع اللہ خاں صاحب بہادر نے پڑھا اور ایجاب و قبول کرایا۔ مبارک سلامت کا شور ہوا۔ شاہ امین الدین قیصر نے ایک عمدہ سہرا کہا تھا وہ پڑھا، ایک سہرا میں نے کہا تھا وہ پڑھا گیا۔ کچھ اور لوگوں نے سہرے کہے تھے وہ پڑھے گئے۔ نواب محسن الملک اور مولوی صاحب اور دوسرے قابل لوگوں نے میرے اور شاہ امین الدین صاحب کے سہرے کو بہت پسند کیا۔ میرا سہرا میرے پاس موجود ہے، میں اسے یہاں لکھے دیتا ہوں۔

سہرا

کیا ہی خوش رنگ ہے گلہائے سخن کا سہرا  
ہے اسی کی کوئی تصویر دلہن کا سہرا

روے نوشہ سے ہیں انوار سعادت کے عیاں  
یہ ہے الطاف خداوند زمن کا سہرا

ماشاء اللہ حسینوں میں جو نوشاہ ہے فرد  
چشم بد دور ہے ایک اپنی پھبن کا سہرا

ہے نزاکت سے دولہن کی عرق آلودہ جبین  
ہو گیا ہے اوسے گویا کئ من کا سہرا

یہ ہے دیوار چمن عارضِ نوشاہ چمن  
بن گیا آج حصار اپنے وطن کا سہرا

آفتاب رخ نوشہ کی شعاعیں جو پڑیں  
ہو گیا اور بھی پُر نور دلہن کا سہرا

دیکھو جس گل کو، وہی گوش بر آواز ہے آج  
سنتے ہیں مُرغِ خوش الحانِ چمن کا سہرا

فضل خالق کی تجلی ہے رخِ نوشہ پر  
کیسے یاقوت کہاں دُرِ عدن کا سہرا

کام کرتی نہیں آنکھیں یہ گھنی ہیں لڑیاں  
ہے محافظ نظرِ بد سے دولہن کا سہرا

لیں نہ کیوں بی بیاں خوش ہو کے بلائیں اس کی
سایۂ چادرِ زہرا ہے دولہن کا سہرا

گوشِ دل سے جو سنے کوئی تو آتی ہے صدا
حوریں فردوس میں گاتی ہیں دولہن کا سہرا

خود وہاں پہنچی ہے نوشاہ کے عارض کی شعاع
یہاں بے قدر ہے سورج کی کرن کا سہرا

لب پان خوردہ نوشاہ کا جو عکس پڑا
ہو گیا موتیوں سے لعلِ یمن کا سہرا

بہر نوشاہ یہ کرتا ہوں دعا میں دل سے
اس کے سر فضل خداوند زمن کا سہرا

ہاتفِ غیب پکارا کہ مبارک باشد
رخ سے دولہ نے اوٹھایا جو دولہن کا سہرا

رخ نوشاہ پہ کرتی ہیں جو گردش لڑیاں
کر رہا ہے یہ طواف اپنے وطن کا سہرا

رنگ رخ بھی ہے نزاکت سے دولہن کو اک بار
اوس کے سر پر تو ہو گلہائے سخن کا سہرا

کیوں ضیاے رخِ نوشہ سے نہ خیرہ ہوں نگاہ
چاند کے منہ پہ ہے سورج کی کرن کا سہرا

میں نے دیکھا نہیں سنتا ہوں مگر اے اکبرؔ
ہے اسی بحر میں اک صاحبِ فن کا سہرا

اب شیرینی تقسیم ہوتی ہے۔ سیر بھر سے زیادہ ہے، ایک چینی کی متوسط رکابی میں ہے۔ برات کا بڑا ہجوم ہے۔ بہت رکابیاں تقسیم ہوئیں۔ مہتمم خوش انتظام ہیں، کسی کو شکایت نہیں۔ مجھے چند حصے شیرینی کے ملتے تھے، میں نے پوچھا کہ یہ زیادہ کیسے ہیں۔ ایک صاحب نے فرمایا کہ آپ نے سہرا ابھی پڑھا تھا۔ میں نے کہا: بھئی، میں نے سہرا ہرگز کسی دنیاوی امید سے نہیں پڑھا، حمید اللہ خاں مد اللہ عمرہ کو میں نے صغر سنی میں بہت گود میں کھلایا ہے، یہ اسی محبت کا تقاضا ہے۔ ورنہ مجھے امرا کے سلام کا دماغ کہاں۔ میں نے اپنا ایک حصہ لیا اور واپس کردی، مگر ان لوگوں نے نہایت شرافت و اہلیت کے طریقے سے اصرار کیا۔ ماشاء اللہ سب لوگ خلیق تھے۔ مولوی سید مہدی علی خاں محسن الملک میرے قریب بیٹھے تھے، انھوں نے مجھ سے اس سہرے کے اکثر اشعار مکرر پڑھوائے۔

صائب دو چیز می شکند قدر شعر را
تحسین ناشعور و سکوت سخن شناس

اب ہم مجلس نکاح سے نماز کے واسطے اٹھ کر باہر جو آئے تو سامان جہیز دیکھا۔ واقعی یہ شادی نواب سرور جنگ بہادر نے بڑی دریا دلی سے کی ہے۔ اگر اس کی فہرست ہو تو یہ رسالہ بہت طویل ہو جائے۔ اب میں نماز پڑھ کر فرودگاہ پر آیا اور برات شام کو نہایت شان و شوکت کے ساتھ واپس آئی اور ہم نے شب بہ آرام بسر کی۔

اب آٹھویں رجب روز سہ شنبہ ہے اور ولیمہ کی دعوت ہے۔ اس وقت مولوی صاحب کے معزز مہمان نوید شادی کی رسم ادا کیا چاہتے ہیں اور ہر ایک دس دس پانچ پانچ اشرفیاں نذر کر رہا ہے، مگر ہمارے سیر چشم مخدوم و مکرم مولوی محمد سمیع اللہ خاں صاحب بہادر نے نہایت پاکیزہ لفظوں میں سب کا شکریہ ادا کیا اور ایسی خوبصورتی سے ان کو واپس کیا کہ کسی کو ناگوار نہ گذرا۔ إن من البيان لسحرا۔ حقیقت میں بعض بیان تو جادو ہی ہوتا ہے۔ مولوی صاحب کی یہ تقریر تو اسی حدیث کے مصداق تھی۔ اب چونکہ وقت دعوت ولیمہ کا آگیا ہے، لہٰذا خیموں میں اور فرودگاہوں میں دستر خوانوں پر عمدہ عمدہ کھانے چنے ہیں، مہمان کھاتے ہیں اور رخصت ہوتے جاتے ہیں۔

کرے جس قدر شکر نعمت وہ کم ہے
مزے لوٹتی ہے زبان کیسے کیسے

ہم نے بھی کھانا کھایا اور زینت المساجد کی طرف روانہ ہوئے۔ اب ہم تنہا ہیں، رفقا بچھڑتے جاتے ہیں، کسی کی گٹھری بندھی ہوئی ہے، کوئی پابرکاب ہے، کوئی روانہ ہو چکا ہے۔

جہاں کے بحر میں مثل حباب گھر رکھنا
سفر عدم کا لگا ہے بند ہی کمر رکھنا

ہم تنہا زینت المساجد میں پہنچ گئے۔ یہ مسجد جامع مسجد کی نصف ہے، یعنی جنوباً و شمالاً ۷۵ قدم ہے۔ بالکل ویران ہے۔ اس میں سات در ہیں، بیچ کا در بڑا ہے، تین گنبد سنگ مرمر کے جن پر سنگ سیاہ کی تحریریں ہیں

اور دو پتلے اور خوبصورت مینار ہیں۔ یہاں نہ کوئی نمازی آتا ہے، نہ اس کی مرمت ہوتی ہے۔ لبِ دریا یہ مسجد واقع ہے اور پریٹ کی زمین میں یہ مسجد ہے۔ ادھر اُدھر انگریزوں کی کوٹھیاں ہیں۔ میں نے عصر کی نماز یہیں پڑھی۔ اس کے دریا کی طرف کے حجروں میں جو پورب کی سمت واقع ہیں، بیوا بے کس شاہزادیاں رہتی ہیں اور فاقے کرتی ہیں۔ کہاں جائیں، کس سے اپنی مصیبت کا بیان کریں۔

کرتے ہیں جو کچھ بتان بے وفا کس سے کہیں
کون سنتا ہے ہماری، خدایا کس سے کہیں

اِن کی زبان اور محاورے سننے اور یاد کر لینے کے قابل ہیں۔ عمریں اِن کی آخر ہو گئیں ہیں۔ ان میں سے اکثر شمع سحری ہیں جو بہت قریب زمانہ میں بجھ جائیں گی۔ یہ مسجد عالمگیر بادشاہ رحمۃ اللہ علیہ ونور اللہ مرقدہ کی بیٹی کی بنائی ہوئی ہے۔ اس کا نام فاطمہ المخاطب بہ زینت النسا بیگم ہے، اس کی قبر پر یہ شعر کندہ ہے۔

مونس ما در لحد فضل خدا تنہا بس است
سایہ از ابر رحمت قبر پوش ما بس است

وفات ۱۱۲۲ھ اور یہ آیت بھی بالین قبر لوح پر کندہ ہے: قل يا عبادي الذين الخ۔ اب ہم اپنی فرودگاہ پر جو آئے تو وحشت ہونے لگی۔ یا تو ابھی یہ مکان بھرا پُرا چھوڑ گئے تھے یا ہو کا میدان ہو گیا۔ مکان اسی طرح سے آراستہ ہے، مکین ایک بھی نہیں۔ اسی طرح ہم سے ایک روز یہ دنیا خالی ہو جائے گی، ہم نہیں جہاں نہیں۔ رباعی۔

دنیا بنگاہ چشم بینا نفسے　　رفعت بخدا قسم کہ آن ہم قفسے
ہیہات کہ ہر کسے برائے نفسے　　ہم در قفسے و ہم بدام ہوسے

آج کی شب تو اسی اپنے کمرے میں آرام کیا۔

اب نویں رجب روز چہار شنبہ کی صبح ہے۔ آج شاہ امین الدین قیصر بھی الہ آباد جاتے ہیں اور ہم کو جناب مولوی صاحب اجازتِ وطن نہیں دیتے۔ کچھ روزوں اور بھی آب و دانہ دہلی شریف کا کھانا پینا ہے۔ اب ہم اپنی پہلی فرودگاہ سے اٹھ کر ۴ نمبر کی کوٹھی میں آ گئے۔ یہ انگریزی قطع کی نہایت خوش نما کوٹھی ہے۔ سب کمرے آراستہ، آب و ہوا اچھی، منظر اچھا۔ الحمد للہ کہ مولوی محمد حمید اللہ خاں صاحب کی شادی نہایت حسن و خوبی سے انجام کو پہنچی، لیکن اب چالوں کا ہجوم ہے۔ ہر روز ایک برادری کے آدمی کے ہاں چالا ہوتا ہے اور دعوتیں ہوتی ہیں۔ بریانی اور قورمہ سے نفرت ہو گئی ہے۔ اب ہماری سات تاریخیں بالکل بے کار گذریں۔ پانی جو برس گیا تو اس غضب کی سردی پڑی کہ برف جمنے لگا۔ کوٹھی سے باہر نہیں نکلا جاتا۔

۱۷ر رجب روز پنجشنبہ کو جناب شاہ امیر حسین صاحب صابری نے جو سجادہ نشین حضرت شاہ صابر بخش رحمۃ اللہ علیہ کے ہیں، اپنی خانقاہ میں میری دعوتِ سماع و طعام دونوں کی کر گئے تھے۔ یہ خانقاہ اس کوٹھی سے بہت قریب ہے۔ میں عصر کے بعد وہاں پہنچا۔ سماع ہو رہا تھا، بہت محبت سے میری مشایعت کی۔ دو لڑکے گا رہے تھے، آوازیں سریلی، قوالی کی قطع بہت اچھی، غزلیں اساتذہ کی صحیح یاد ہیں، بہت ٹھہرے ہوئے سلجھے ہوئے گا رہے تھے۔ درمیان میں مغرب کی نماز پڑھی اور پھر سماع شروع ہوا۔ عشا تک یہ صحبت رہی اور یہ صحبت بہت بالطف رہی۔ خانقاہ بھی بہت خوبصورت ہے۔ صاحب سجادہ کے اخلاق بھی پاکیزہ ہیں۔ یہ شاہ صابر بخش علیہ الرحمۃ کے پوتے ہیں، اِن کے والدِ ماجد حضرت سید شاہ عبد اللہ صاحب کا مزار بھی اسی خانقاہ میں حضرت شاہ صابر بخش رحمۃ اللہ علیہ کے پہلو میں ہے۔ حضرت شاہ صابر بخش قدس سرہ کی تاریخ وفات یازدہم ربیع الاول ۱۲۲۸ھ ہے اور حضرت شاہ عبد اللہ صابری قدس سرہ کی تاریخ وفات ۲۲ر ماہ شعبان ۱۳۰۴ھ ہے۔ جناب شاہ امیر حسین صاحب واقعی نہایت خلیق درویش ہیں۔ عصر کے بعد فقیر کی فرودگاہ پر تشریف لاتے تھے اور دیر تک یہ با کیفیت صحبت قائم رہتی تھی۔

مرد را ہر چند تنہائی کند کامل عیار
صحبتِ یارانِ یک دل کیمیاے دیگر است

آج اٹھارویں رجب ۱۳۱۱ھ کی صبح اور جمعہ کا روز ہے۔ نماز جمعہ کے بعد ہم حضرت شیخ المحدثین خاتم العلما حضرت مولانا شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت خواجہ میر درد قدس سرہ کے مزارات کی زیارت کو روانہ ہوئے۔ دہلی دروازے سے نکل کر حضرت نظام الدین صاحب کی سیدھی سڑک تھام لی۔ راستہ معلوم نہ تھا اور کوئی واقفِ راہ بھی ہمراہ نہ تھا۔ مقصود اصلی سے بہت دور آگے بڑھ گئے۔ جس سے پوچھتے ہیں وہ پتا نہیں بتلاتا۔ کیا خوب فرمایا ہے حضرت مولانا روم قدس سرہ نے ؎

ہر کہ در رہ بے قلاوزی رود

ہر دو روزہ راہِ صد سالہ شود

کبھی آگے بڑھتے ہیں اور کبھی پیچھے پلٹتے ہیں۔ آخر کو قیاس کے اثر پر چلے اور یہاں ضرورت قیاس کی تھی۔

## قیاس

اہلِ تقلید رحمہم اللہ علیہم اجمعین کا یہ مسئلہ ہے کہ جب مجتہد کسی مسئلہ میں غور کرے تو پہلے کتاب اللہ کی طرف رجوع کرے، اگر وہاں مشکل کشائی ہوئی تو سبحان بحمدہ، وگرنہ حدیث شریف کی طرف توجہ کرے۔ اگر یہاں بھی پتہ نہ لگے اجماع امت کی طرف جائے، اس کے بعد قیاس کا مرتبہ ہے ؎

مجتہد ہر گہ کہ باشد نص شناس　　اندرین صورت نیندیشد قیاس

ہر کہ او اول قیاسکہا نمود　　پیش انوار خدا ابلیس بود

حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے کہیں کتاب اللہ یا حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں قیاس نہیں کیا ہے۔ چنانچہ سورہ فاتحہ خلفِ امام کے ہی مسئلہ میں دیکھ لیجیے۔ ہمارے بعض برادران اسلام امام کے پیچھے الحمد پڑھنی مسلم کی اس حدیث کی قوت سے فرض کرتے ہیں۔ حدیث مسلم: ابوهريرة مَنْ صلّى صلاةً لَمْ يقرأ فيها بأمِّ القُرآن فهي خِداج هي خداج هي خداج۔ ترجمہ: حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں کہ کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جس نے نماز پڑھی اور اس میں سورہ فاتحہ نہ پڑھی تو وہ نماز

ناقص ہے، ناقص ہے، ناقص ہے۔ اس حدیث سے ہم دو باتوں کا استنباط کرتے ہیں: ایک تو یہ کہ آپ نے ناقص کا لفظ فرمایاہے اور نقص دلیل وجوب ہے نہ فرضیت۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس حدیث کو جب حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت کے سامنے بیان کیاتو وہ سب متحیر ہو گئے اور پوچھنے لگے کہ کیا ہم امام کے پیچھے بھی سورہ فاتحہ پڑھیں اور اگر پڑھیں تو اس کا کیا طریقہ ہے؟ اس سے معلوم ہوا کہ وہ پوری جماعت صحابہ کی سورہ فاتحہ امام کے پیچھے نہیں پڑھتی تھی، وگرنہ وہ کبھی اس حیرت سے نہ پوچھتی۔ ان کے استفسار کا جواب حضرت ابوہریرہ نے یہ دیا کہ اپنے دل میں پڑھ لیا کرو۔ مگر ہمارے برادران غیر مقلد تو اس طرح پڑھتے ہیں کہ ان کے پہلو والا خوب اچھی طرح سن لیتا ہے۔ اور دل میں پڑھنے کا یہ طریقہ ہے کہ امام پڑھ رہاہے اور مقتدی کا دل ان لفظوں کو قبول کرتا جاتا ہے۔ اب حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل سنیے، وہ فرماتے ہیں کہ جہاں ہم کو صریح نص ملے گی ہم اسی کو مقدم رکھیں گے۔ یہ آیت شریف وہ پیش کرتے ہیں: وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ۔ ترجمہ: اور جس وقت قرآن پڑھا جائے، سنو اس کو اور چپ رہو شاید کہ تم پر رحم کیا جائے، انتہیٰ۔ دیکھ لیجیے سکوت کے ساتھ رحم کا وعدہ بھی لگا ہوا ہے۔ اب اہلِ انصاف ان دونوں مسّلوں میں خود فیصلہ کرلیں اور مجرد تعصب کی وجہ سے زبان کو سب و شتم کے ساتھ گویا کرنا اہلِ دانش کا کام نہیں ہے۔ اللہ تعالی شانہ ہمارے مسلمان بھائیوں کے دلوں کو انوارِ حقانیت سے منور فرمائے۔ بے فائدہ گمان فاسد کسی کی طرف کرنا شانِ اسلام سے نہیں ہے جیسا کہ اللہ مغفرت کرے نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے اپنی تصانیف میں کنایتاً اور صراحتاً حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کو اکثر مقام پر نہایت نازیبا طریقہ سے یاد کیاہے۔ چنانچہ ان کے قطعہ کے دو مصرعے مجھے یاد ہیں، اہلِ علم اسے پڑھ کر متحیر ہوں گے۔ نواب صاحب کے قطعہ کے دو مصرعے

قیاس باطل و اجماع بے اثر آمد
بجز دو نوع نخستین نباشد اصل اصول

الغرض میں بھی اپنے قیاس کی رہبری پر ایک طرف کو چل نکلا۔ یہاں تک کہ محبس کی پشت پر پہنچا اور وہاں سے تھوڑی دور پر ایک چھوٹی سی مسجد اور کچھ قبریں نظر آئیں۔ بس دل نے خبر دی کہ ہو نہ ہو یہی مقابر علماے واصلین ہے۔ جب میں اس خاک کے روشن ٹکڑے پر پہنچا تو مسجد کے دکھن کی طرف چند قبریں چونہ گچی کی نظر آئیں۔ اب یہ فکر ہوئی کہ یہ کیوں کر معلوم ہو کہ حضرت شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کی خواب گاہ یہ ہے اور حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی خواب گاہ وہ ہے۔ اتفاق وقت سے میں اول جس قبر پر کھڑا ہوا، وہی مزار حضرت شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کا تھا۔ وہاں میں نے ایک صاحب کو نماز پڑھتے دیکھا، ان کے سلام پھیرنے کا انتظار کیا۔ جب وہ سلام پھیر چکے تو میں نے ان سے پوچھا کہ حضرت شاہ صاحب کا مزار کون سا ہے؟ انھوں نے کہا: یہی ہے جہاں تم کھڑے ہو۔ دیکھ لو قبر کے سرہانے نام اور تاریخ ان کی کھدی ہوئی ہے۔ اس وقت جو کیفیت دل کی ہوئی دل ہی جانتا ہے ؏

دلِ من داند و من دانم و داند دل من

ہے تو یہ زمین کا بہت چھوٹا سا ٹکڑا مگر فلکِ اقمار ہے۔ آسمانِ دنیا میں ایک چاند اور یہاں اتنی چھوٹی سی زمین میں چار چاند۔ یہ وہی چاند ہیں کہ جن کے سبب سے زمانے کے منہ کو چار چاند لگ گئے، بلکہ یہ زمین آسمان چہارم ہے اور یہ بزرگوار چار آفتاب علوم ہیں۔ اس مسجد کی دکھن کی طرف اندازاً زمین سے آٹھ اُنگل اونچا ایک چونہ گچی کا چبوترہ ہے۔ اس پر مغرب کی طرف احاطہ کی دیوار سے ملا ہوا ایک مزار ہے، اس کا کچھ حال نہیں معلوم ہوا۔ اس کے پہلو میں مشرق کی طرف جو مزار ہے وہ حضرت شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کا ہے، اس پر آپ کا نام نامی اور سنہ وفات ۱۲۴۰؁ ہجری کندہ ہے۔ آپ کے مزار کے پائیں آپ کے برادر خُرد حضرت مولانا شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ کا مزار ہے اور اس مزار کے سرہانے آپ کا نام نامی اور سنہ وفات ۱۲۳۳؁ھ کندہ ہے۔ حضرت شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کے پہلو میں مشرق کی طرف حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا مزار ہے اور اس پر آپ کا نام عربی خط میں کُھدا ہے اور آپ کے پائیں حضرت مولانا شاہ عبد القادر رحمۃ اللہ علیہ کا مزار ہے اور اس مزار کے سرہانے آپ کا نام نامی اور سنہ وفات ۱۲۳۶؁ھ کندہ ہے اور حضرت

مولانا شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے پہلو میں مشرق کی طرف آپ کے والد ماجد حضرت شاہ عبد الرحیم صاحب قدس سرہ کا مزار مبارک ہے۔ یہ بزرگ حضرت شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کے جد امجد ہیں اور ان کو طریقہ ابو العلائیہ میں واسطہ ہے اور دوسرے طُرق میں بھی فیض یاب ہیں۔ مولوی عبد القیوم صاحب مرحوم جو بھوپال میں تشریف رکھتے تھے ان کے پاس حضرت مولانا شاہ عبد العزیز محدث دہلوی قدس سرہ کا ایک بیاض تھا جس میں ان کے دستِ خاص کا لکھا ہوا تھا کہ الحمد للہ کہ مجھ میں یہ نسبت اور طرق کے کیفیت طریقہ ابو العلائیہ غالب ہے۔ ایک صاحب مرزا ولی بیگ دہلی کے رہنے والے مجھے حضرت شاہ عبد العزیز صاحب قدس سرہ کے مزار پر ملے۔ وہ بیان کرتے تھے کہ تاریخیں جو اِن مزاروں پر کندہ ہیں جناب ممتاز علی خاں صاحب رئیس میرٹھ نے کندہ کرائیں ہیں، جزاہ اللہ فی الدارین خیراً۔ واقعی اگر یہ تاریخیں ان پر کندہ نہ ہوتیں تو ان بزرگوں کی قبروں کا بتانے والا آج کوئی موجود نہ تھا۔ افسوس ہماری قوم میں سے اب کوئی شخص ایسا باقی نہ رہا کہ ہمارے والیان ملک کو اس طرف متوجہ کرے کہ اِن کے بقائے نام ونشان کے لیے ان کے مزارات پر گنبد قائم کر دیا جائے تا کہ ان کی زیارت کرنے والوں کو کسی دوسرے راہبر کی ضرورت نہ ہو۔ ہائے صد وائے یہ وہ آفتاب علوم ہیں کہ آسمان علم جن کی ذات سے روشن ہے، مگر آج یہ چند مشت خاک کے اندر ایسے روپوش ہیں کہ ہم ڈھونڈتے پھرتے ہیں اور پتا نہیں لگتا؏

عالم ہمہ افسانہ ما دارد و ما ہیچ

واہ رے تیری بے نیازی! کس عظمت و جلالت کے بزرگوار کس گُم نامی کے ساتھ ہم سے پردہ کیے ہوئے پڑے ہیں کہ جن کی قبروں کا نشان دشواریوں سے ملتا ہے اور پھر لطف یہ ہے کہ دہلی سے شہر میں۔ اور جب ہم مزار پر آکر سلام پڑھتے ہیں تو جواب درکنار سانس لینے کی آواز تک نہیں آتی۔ اللہ اللہ طبقہ خاک بھی کیا باادب مقام ہے ؎

ادب گاہیست در زیرِ زمین از عرش نازک تر — نفس گرم کردہ می آید جنید وبایزید اینجا
چُنان مدہوشِ جام آرزوے وصل شد عزت — کہ از مستی بدوش دیگران بیخود رسید اینجا

یہ شہر خموشاں بھی کیا آرام کی بالطف وپر رونق بستی ہے کہ تمام بستیاں ویران ہوتی جاتی ہیں مگر یہ روزانہ آباد ہوتی جاتی ہے اور یہاں کچھ ایسی دل چسپی ہے کہ آدمی جب یہاں پہنچا تو اپنے جملہ اعزہ واقربا، دوست احباب سب کو بھول جاتا ہے۔

شکوہ ہے رفتگانِ مقامِ بعید کا
ایسے گئے کہ خط بھی نہ لکھا رسید کا

مگر خیال کیا تو معلوم ہوا کہ اس عالمِ جمعیت میں انسان کو کچھ ایسا اطمینانِ نفس ہو جاتا ہے کہ ہر قسم کے تردداتِ سے نجات ہو جاتی ہے۔ پھر وہ کس کی طرف رجوع کرے اور کس کو اپنے حال سے خبر دے۔ فی الحقیقت اصلی گوشۂ عافیت یہی مقام ہے۔

مسجد میں تو شیخ کو خروشاں دیکھا　　مے خانے میں جوشِ بادہ نوشاں دیکھا
ایک گوشۂ عافیت جہاں میں اے امیر!　　دیکھا تو محلہ خموشاں دیکھا

وہ گوشہ عافیت یہی ہے۔ لیکن اگر طالب مرد ہے اور ہمت بلند رکھتا ہے تو وہ فیاض حقیقی اس کو یہ مقام قبل اس مقام میں پہنچنے کے بھی عطا فرما سکتا ہے، جیسا کہ کسی راہ رفتہ نے ارشاد فرمایا ہے۔

ہمچون من آن زمان تو پاک شوی
خاک شو پیش ازانکہ خاک شوی

اب ہم حضرت خواجہ میر درد رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کی زیارت کو جاتے ہیں۔ یہاں سے وہ جگہ نظر آرہی ہے۔ مرزا ولی بیگ صاحب ہمارے ساتھ ہو گئے ہیں۔ وہ بعض اور مقامات کا بھی نشان دیتے جاتے ہیں۔ فاصلہ بہت کم تھا، ہم جلد پہنچ گئے۔ یہ سب مزارات چونہ گچی کے ہیں جیسے کہ حضرت شاہ عبد العزیز قدس سرہ اور ان کے اجداد کے ہیں۔ لیکن مزارات کے سرہانے بڑی بڑی لوحیں سنگ سرخ کی نصب ہیں اور ان میں بخط نسخ و نستعلیق بہت کچھ لکھا ہوا ہے۔ مگر سب مزارات زیر آسمانِ نیلی ہیں، حتیٰ کہ درختوں کا

بھی سایہ نہیں ہے۔ واقعی فقرا اور غربا کے لیے اس سے زیادہ بلند اور خوش نما کوئی گنبد مزار کے لیے موزوں نہیں۔

خدا دراز کرے عمر چرخ نیلی کی
کہ ہم غریبوں کی تربت کا شامیانہ ہوا

اس مقام پر سب سے پہلے میں افسوس کے ساتھ یہ کہنا چاہتا ہوں کہ خواجہ ناصر وزیر مرحوم جو حضرت خواجہ میر درد رحمۃ اللہ علیہ کے سجادہ نشین حال تھے، نہایت لائق و متین و سنجیدہ شخص تھے۔ وہ داناپور میں مجھ سے ملنے آئے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد اس بقعہ متبرکہ کی یہ حالت ہو گئی۔ اس وقت جو متوسل اس خاندان کے ہیں، وہ اپنے اجداد کی روحوں کو ایذا پہنچا رہے ہیں۔ جو مزارات پر درخت سایہ کیے ہوئے تھے، ان کو بھی کاٹ کر بیچ ڈالا۔ بعض مزار کی لوح بھی اکھاڑ کر فروخت کر ڈالیں۔ واقعتاً حضرت سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے بہت درست فرمایا ہے۔

ززنِ باردار اے مرد ہشیار　　اگر وقتِ ولادت مار زایند
ازاں بہتر بہ نزدیک خردمند　　کہ فرزندان ناہموار زایند

حضرت خواجہ میر درد رحمۃ اللہ علیہ مرجع فنون و مجمع علوم تھے۔ شعرا کی صف میں مسلم الثبوت استاد، فقرا کے حلقہ میں شیخ کامل، اہل سیادت کے طبقہ میں صحیح النسب سید۔ علمی سرمایہ بھی اگر بہت نہ تھا تو ایسا کم بھی نہ تھا۔ فن انشا میں ان کی قابلیت رسالہ ہائے نالۂ درد، آہِ سرد، دردِ دل، شمعِ محفل کے مطالعہ سے بخوبی ظاہر ہو جاتی ہے۔ یہ سب رسالے قابل دید ہیں۔ توکل ان کا دہلی میں مشہور ہے، فاقہ ان کے خاندان میں ترکۂ نبوت سمجھا گیا تھا۔ ہزار افسوس کہ ایسے خاندان کی اولاد اور ناہموار۔ خوب غور کیا تو معلوم ہوا کہ یہ بری صحبتوں کا اثر ہے۔

صحبتِ سفلہ چو انگشت نماید نقصان　　گرم سوزد بدن و سرد کند جامہ سیاہ

## امرا کی خدمت میں التماس

طبقہ امرا سے جن کو اللہ تعالیٰ شانہ نے دولتِ اولاد سے بہرہ کامل عطا فرمایا ہے، ان کو لازم ہے کہ اپنی اولاد کی تربیت کے واسطے یا تو اپنے اخلاق کو مزکی کریں یا ان کو کسی نیک مرد کی اتالیقی میں دے دیں۔ وہ شبانہ روز اس کی صحبت میں رہے اور ان کے اخلاق سیکھیں، ورنہ یہی حالت پیش آنے والی ہے جو اس خاندان کے ناہموار لڑکوں کی ہے۔ یا قوم قولوا إنا لله وإنا إليه راجعون۔ اگرچہ اس احاطے میں مزارات بہت سے ہیں مگر سب سے اونچا مزار جو مقبرے کے وسط میں ہے، وہ حضرت خواجہ محمد ناصر متخلص بہ عندلیبؔ کا ہے رحمۃ اللہ علیہ۔ یہ حضرت خواجہ میر درد رحمۃ اللہ علیہ کے والد اور پیر ہیں۔ آپ کی ولادت ۲۵؍ شعبان ۱۱۰۵ھ ہجری میں ہے، اس مصرع سے آپ کی تاریخ ولادت نکلتی ہے۔ مصرع

وارثِ علم امامَین و علی

اور رحلت آپ کی روز شنبہ بعد العصر قریب شام دوم شعبان ۱۱۷۲ھ ہجری کو واقع ہوئی۔ طریقہ آپ کا نقشبندیہ مجددیہ ہے۔ چونکہ آپ کے مرشد پاک کا نام مبارک شاہ گلشن رحمۃ اللہ علیہ تھا، اس لیے آپ نے اپنا تخلص عندلیب کیا اور ایک بہت بڑی مبسوط کتاب تصوف میں لکھی اور اس کا نام نالۂ عندلیب رکھا۔ اور اس کی شرح نہایت واضح حضرت خواجہ میر درد رحمۃ اللہ علیہ نے لکھی ہے جس کا نام علم الکتاب ہے۔ دوسرا مزار حضرت خواجہ محمد ناصر رحمۃ اللہ علیہ کے پہلو میں مغرب کی طرف آپ کے فرزند رشید حضرت خواجہ میر درد رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ آپ کے مزار مبارک کی لوح پر لکھا ہوا ہے: هو الناصر نور الناصرين اول المحمدئين خواجہ میر علی محمدی المتخلص بہ درد تحيات الله عليه ووالديه و على من توسل إليه۔ اور یہ ایک رباعی لوح کے نیچے کندہ ہے۔ رباعی ؎

خورشید ضمیر خواجہ میر درد است — ہم میر و فقیر خواجہ میر درد است
ہم بدرِ مُنیر خواجہ میر درد است — ہم مرشد و پیر خواجہ میر درد است

ولادت آپ کی نوزدہم ذی قعدہ ۱۱۳۳ھ ہجری روز سہ شنبہ کو واقع ہوئی اور رحلت آپ کی ۲۴؍ صفر قبل صبح صادق ۱۱۹۹ھ ہجری کو واقع ہوئی۔ عمر شریف ۶۶ برس کی ہوئی۔ تیسرا مزار جو حضرت خواجہ میر درد رحمۃ اللہ علیہ کے پہلو میں مغرب کی طرف کو ہے، وہ آپ کے چھوٹے بھائی جناب خواجہ اثر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ اس مزار مبارک کی لوح پر یہ رباعی کندہ ہے۔ رباعی ؎

از بسکہ غلامِ خواجہ میریم اثر　　زیرِ اقدام خواجہ میریم اثر
از رحمتِ حق زندۂ جاوید شوم　　ہر گاہ بنامِ خواجہ میریم اثر

إنا لله وإنا إليه راجعون و برضائه راضون وبلقائه راجون رضی الله تعالی عنه وأرضاه عنّا۔

کیا کہیں یہاں بہت دل لگا لیکن دھوپ نہایت سخت تھی، دو گھنٹے بھی نہ بیٹھ سکے۔ نیک بخت اولاد نے دو پیڑ بھی سایہ کے واسطے نہ چھوڑے۔ حالانکہ یہ مقام حضرت خواجہ میر درد کی بغیا مشہور ہے ؎

اولاد نبی کہ بر طریقش نبود
چون آیہ منسوخ کلام اللہ است

اب ہم یہاں سے سیدھے فتحپوری مسجد کو جاتے ہیں۔ وہاں کچھ لوگ داخل سلسلہ ہونے والے ہیں اور منشیِ مسجد یعنی مجی منشی نیاز علی صاحب کے ہاں دعوت ہے۔ ترکمان دروازے سے ایک بہت تیز گاڑی کرایہ کی اور بہت جلد فتحپوری میں پہنچ گئے۔

## فتحپوری مسجد کا حال قابلِ ملاحظہ

بانی اس مبارک مسجد کی شاہجہاں بادشاہ رحمۃ اللہ علیہ کی ایک بیگم ہیں جن سے بادشاہ نے فتحپور سیکری میں نکاح کیا تھا۔ یہ بی بی نہایت نیک بخت اور نیک نیت تھی۔ اس کی مسجد ہمیشہ سے آباد بھی چلی آتی ہے۔ آج کل اس کی ماہانہ آمدنی پانچ سو ستر روپے دو آنے ہیں۔ ایامِ غدر میں اس مسجد کی جائداد ضبط ہو کر نیلام ہوگئی تھی جس کو چھنّا مل نے ۲۹ ہزار روپیہ کو خرید لیا تھا۔ لیکن دربار قیصری کے زمانہ واقع ۱۲۹۵ھ

مطابق ۱۸۷۷ء میں گورنمنٹ نے اسے واگذاشت کر دیا۔ جب سے اس مسجد کا انتظام مسلمانوں کی ایک جماعت نے اپنے ذمہ لے لیا۔ آج کل اس کے یہ دس ممبر ہیں: شاہزادہ ثریا جاہ صدر انجمن، حافظ عزیز الدین وکیل، محمد اکرام اللہ خاں، حکیم لطیف حسین خاں، منشی کرم اللہ خاں، حکیم محمد اجمل خاں، منشی محمد فخر الدین، مولوی محمد انوار الحق، ڈپٹی محمد الٰہی بخش خاں، شیخ اللہ دیا۔ اس مسجد میں ایک مدرسہ اسلامی بھی ہے جس میں بہت طلبہ پڑھتے ہیں۔ فقہ، تفسیر، حدیث وغیرہم سب علوم پڑھائے جاتے ہیں۔ ۱۲۹۵ھ سے ۱۳۱۰ھ تک چھپن طالب العالم فارغ التحصیل ہو کر اس مدرسہ سے نہایت احترام کے ساتھ اپنے اپنے وطنوں کو روانہ ہوئے اور اس وقت بہت سے طالب العلم جماعت اول کے جو فن حدیث میں بخاری اور مسلم پڑھتے ہیں جو ان شاء اللہ تعالیٰ سال آئندہ دستارِ علم زیب فرق فرمائیں گے، الحمد للہ علی احسانہ۔

اس مدرسہ کے مدرس اول مولوی محمد عبد الحق ہیں جو اسی مدرسہ میں فارغ التحصیل ہوئے ہیں۔ ان کی تنخواہ چالیس روپیہ ہیں اور مدرس دوم مولوی حبیب احمد ہیں، ان کی تنخواہ پندرہ روپیہ ہیں۔ مدرس سیوم حافظ محمد عمرہ ہیں، یہ صرف نحو پڑھاتے ہیں، اِن کی تنخواہ دس روپیہ ہیں۔ مدرسِ چہارم الٰہ بخش ہیں، یہ فارسی پڑھاتے ہیں، ان کی تنخواہ گیارہ روپیہ ہیں۔ پانچویں مدرس حافظ رحیم بخش ہیں، یہ معلم القرآن ہیں، ان کی تنخواہ چھ روپیہ ہیں۔ افسوس کہ ہمارے شہر اکبر آباد کی جامع مسجد کے تین سو روپیہ ماہوار سے زیادہ آمدنی ہے اور اس میں مدرسہ بھی ہے مگر معلوم نہیں کہ کیسی تعلیم ہوتی ہے کہ اب تک دو چار لڑکے بھی عالم ہو کر نہ نکلے۔ ہم مسلمانوں کی حالت بہت قابلِ افسوس ہے۔ علی الخصوص تعلیم کی طرف سے دنیا میں مسلمان ہی کی وہ قوم ہے کہ جس نے علمی ترقی کا نشان تمام دنیا میں گاڑ دیا تھا۔ خلفاے عباسیہ کے عہد میں ابو نصر فارابی یونانی اور سریانی زبان کا ماہر تھا۔ اس نے ان زبانوں سے علوم کی بہت سی کتابیں ترجمہ کیں۔ مہدی بن جعفر منصور کے زمانہ میں خاندان برامکہ کے اہتمام سے ژند، یونانی، شامی و سنسکرت زبانوں سے طب و حکمت کی کتابیں ترجمہ ہوئیں۔ یونانی فلسفہ کی کل کتابیں قسطنطین قیصرِ روم کے زمانہ سے ایک مکان میں بند تھیں اور اس کے بعد سے جو بادشاہ ہوتا گیا وہ ایک قفل اُس مکان پر بڑھاتا گیا۔ خیال یہ تھا کہ فلسفہ کے جاری ہونے

سے دین مسیحی کو سخت ضرر پہنچے گا۔ مامون رشید نے قیصرِ روم کو خط لکھا کہ وہ کتابیں دار الخلافت بغداد میں بھیج دے۔ اس نے یہ سمجھ کر کہ فلسفہ جوشِ اسلام کو سرد کر دے گا، اس طلب کو بہت غنیمت سمجھا اور وہ کل کتابیں اونٹوں پر لدوا کر بھیج دیں۔ مامون رشید کے زمانہ میں سب سے بڑا مترجم یعقوب کندی تھا۔ اس زمانہ میں بہت سی کتابیں یونانی، فارسی، کالڈی، قبطی، شامی زبانوں سے ترجمہ ہوئیں۔ متوکل باللہ کے زمانہ میں سب سے بڑا مترجم حنین بن اسحاق تھا۔ ان خلفا کے زمانہ میں مترجموں کی تنخواہ ماہانہ پانچ سو اشرفیاں تھیں۔ دو سو برس تک ترجمہ کرنے کا سلسلہ جاری رہا۔ بعض علما نے سنسکرت سے بھی ترجمہ کیا ہے جیسے ابو ریحان بیرونی، قاضی رکن الدین سمرقندی۔ سلطان فیروز شاہ والی ہندوستان نے بھی جوالا مکھی کے بت خانہ سے سنسکرت کی کتابیں نکلوا کر ترجمہ کروائیں۔ ۱۰ ۴ھ ہجری میں غازی سلطان محمود غزنوی رحمۃ اللہ علیہ نے متھرا کی فتح سے واپس جا کر غزنین میں ایک عالی شان مدرسہ کی بنیاد قائم کی اور ہندوستان کی دولت کا ایک بڑا حصہ اس میں صرف کیا۔ ایک کتب خانہ اس کے شامل تھا جس میں مختلف زبانوں کی کتابیں کثرت سے تھیں۔ اس مدرسہ کے خرچ کے لیے ایک بہت بڑی جاگیر وقف کر دی تھی۔ اس زمانہ کے امرا زمانۂ حال کے اُمرا کی طرح علم سے بے خبر نہ تھے، ایسے علما اور حکما سے محبت رکھتے تھے۔ مسلمانوں میں تعلیم کا بہت بڑا جز سفر تھا، کوئی طالب العلم ایسا نہ تھا کہ جس نے تحصیلِ علم کے لیے کم سے کم چار چار پانچ سو کوس کا سفر نہ کیا ہو۔ مسلمانوں نے جس سرگرمی سے تحصیلِ علوم کے لیے سفر کیا ہے اس کی نظیر کسی قوم کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ ابن خلّکان لکھتے ہیں کہ قاضی ابو یوسف نے علما کا ایک خاص لباس ایجاد کیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ جو ایم اے والوں کو جُبّہ علم دیا جاتا ہے، ضرور ایسا لباس علما کا تتبع ہے۔ مختلف اسلامی ملکوں میں مختلف علوم کی ترقی ہوئی۔ ایران نے معقولات و منقولات میں کمال حاصل کیا۔ مصر و شام میں فقہ، حدیث، اسماء الرجال پر توجہ زیادہ ہوئی۔ اسپین میں زبان دانی و شاعری کو فروغ ہوا۔ ابن الناصر محمد بن قلاؤن نے مصر میں جو مدرسہ قائم کیا وہ رفعت و شان کے اعتبار سے علمی دنیا میں بے نظیر سمجھا گیا ہے۔ تین برس میں اس مدرسہ کی تعمیر ہوئی، ۵۴ لاکھ روپیہ خرچ ہوئے تھے۔ اس کا بڑا کمرہ ۶۵ گز لمبا اور ۶۵ گز چوڑا تھا۔ مَراغہ میں ہلا کو

خاں نے محقق طوسی سے ایک رصد گاہ بنوائی تھی۔ مامون رشید نے ۲۱۵ہجری میں خالد بن عبد الملک وغیرہ سے قاسیون اور بغداد میں رصد گاہیں بنوائیں، پر شرف الدولہ دیلمی نے دوبارہ بغداد میں رصد گاہ بنوائی۔ نظام الملک نے نیشاپور میں مدرسہ نظامیہ قائم کیا جہاں ابو المعالی امام الحرمین اس کے مدرس اعظم تھے اور امام غزالی سے فخر روزگار اس کے مستعد طالب العلم تھے۔ نظام الملک طوسی نے جو شاہانِ آلِ سلجوقی الپ ارسلان ملک شاہ کا وزیر تھا، نظامیہ بغداد کی بناڈالی۔ چھ لاکھ دینار خزانہ شاہی اس مدرسہ کے خرچ کے لیے مقرر کیے اور اپنے کل جاگیر کا دسواں حصہ وقف کر دیا۔ اس کے مدرس اعظم علامہ ابو اسحاق شیر ازی رحمۃ اللہ علیہ تھے اور اس کے اخیر زمانہ کے طالب العلم حضرت سعدی شیر ازی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ اس کے متعلق ایک بہت بڑا کتب خانہ تھا جس کے منتظم علامہ ابو زکریا تبریزی تھے۔ سب سے پہلے اسی مدرسہ میں طلبہ کی تنخواہیں اور وظیفے مقرر ہوئے۔

چھٹی صدی میں ممالک اسلامیہ کا کوئی حصہ ایسانہ تھا کہ جہاں کثرت سے مدارس اور دار العلوم نہ ہوں۔ ایک بغداد میں بیس بڑے نامی مدارس تھے جن میں سے بعض کے اسمایہ ہیں: تاجیہ، مستوفیہ، کمالیہ، بہائیہ، فخریہ، مستنصریہ وغیرہ۔

سلطان صلاح الدین کو اگرچہ جنگ صلیب نے بہت کم مہلت دی، جس پر بھی اس نے ممالک مصرو شام وغیرہ میں بہت سے مدرسے قائم کیے۔ ۵۷۸ھ میں دمشق میں بیس دار العلم تھے۔ اس سلطان کے زمانہ میں یہ حکم تھا کہ اسکندریہ کے مکان مدرسہ میں جو طالب العلم آئے اس کو مکان، خوراک، شفاخانہ، حمام سب کچھ سلطنت کی طرف سے مہیا ملے۔ اس بادشاہ کے عہد میں علما کی تنخواہوں کی تعداد تین لاکھ دینار سالانہ تھے، جس کے پندرہ لاکھ روپیہ سالانہ ہوتے ہیں۔ اس بادشاہ کے زمانہ میں یہ بات بڑے عیب کی سمجھی جاتی تھی کہ کوئی امیر دنیا سے رحلت کرے اور کوئی علمی یادگار نہ چھوڑ جائے۔ اندلس میں کوئی مستقل مدرسہ نہ تھا، مسجدوں کے صحن درس گاہیں تھیں، لیکن اس پر بھی اندلس کے مسلمانوں کو تمام یورپ کی تعلیم کا فخر حاصل ہے۔ اے مسلمان بھائیو! مری اس بے ربط تحریر کو پڑھنا اور اس پر ذرا غور بھی کرنا، دیکھو

تمھاری کیا حالت تھی اور تم کس حالت کو پہنچ گئے، یہ تو پسندیدہ امر نہیں ہے کہ تم ہمیشہ ایسی حالت میں مبتلا رہو۔ خدا کے واسطے بیدار ہو جاؤ، کب تک یہ خواب غفلت۔

اب میں اکبر آباد کے مسلمان بھائیوں کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ مسجد فتحپوری دہلی کے مدرسہ کی نظیر کے موافق آپ اپنے جامع مسجد کے مدرسہ کی ترقی میں کوششیں کریں وباللہ التوفیق وعلیہ التکلان وھو نعم المولی ونعم النصیر۔ اب میں منشی محمد نیاز علی صاحب کی دعوت سے فراغت حاصل کرکے اپنی فرودگاہ کوٹھی نمبر ۴ واقع محلہ دریاگنج کو واپس جاتا ہوں۔

آج رجب المرجب ۱۳۱۱ھ ہجری کی اکیسویں اور دوشنبہ کا روز ہے۔ صبح کی نماز پڑھی، وظیفہ سے فرصت کی۔ ٹھیک نو بجے کوٹھی کی برساتی میں سواری حاضر ہے۔ حضرت محبوب الٰہی شیخ المشائخ سلطان نظام الدین اولیا زری زر بخش بدایونی قدس اللہ تعالی سرہ العزیز کے سلام کو جاتے ہیں۔ دل یہ کہتا ہے کہ جب حضرت کے سلام کو جاتے ہو تو اور مکانوں کو نہ دیکھو اور یہی ارادہ پختہ ہو گیا۔ سواری پر بیٹھے، مگر دل نے قبول نہ کیا۔ آخر سواری ساتھ لی اور پیدل ہو گئے۔ بزرگوں کی زیارت کے آداب بچپنے سے تعلیم کیے گئے تھے، وہ سب مزاج ہو گئے ہیں (جب لڑکپن سے بچوں کو اخلاقی تعلیم ہوگی تو پھر ان شاء اللہ تعالی تادم مرگ اس کا اثر باقی رہے گا)۔ ہمارے یمین و یسار عمدہ عمدہ پرانی عمارتیں نظر آرہی ہیں، مگر دل عاشق کی طرح سے شکستہ اور ویران پڑی ہیں۔ پہلے دہلی دروازہ سے نکل کر الٹے ہاتھ کی طرف کوٹلہ ملا، ٹوٹا پھوٹا پڑا ہوا ہے۔ جب ایسی مضبوط و مستحکم پتھر کی عمارتیں ٹوٹ پھوٹ کر مسمار ہو گئیں تو اس عمارت کا بنانے والا جو ایک مشت استخوان تھا اس کی ہڈیوں کا کیا ٹھیک ہے۔ اول تو پتا ہی نہیں لگتا کہ وہ کون تھے اور اگر فرض کرو کہ ان کا کچھ حال معلوم بھی ہو جائے تو کیا اس وقت ہماری تعریف و توصیف انھیں فائدہ پہنچا سکتی ہے، کل مرء بما کسب رھین۔ ہر آدمی اپنے کیے کی سزا یا جزا پائے گا، اصل خیر اور ثواب وہی ہے کہ جو آدمی اپنے ہاتھ سے دے لے جائے۔ یہاں پر ہمیں دور سے چند قبریں نظر آئیں، کچھ پتا نہیں کس کی ہیں۔ کوٹلہ سے آگے بڑھے اور یمین و یسار ہزاروں قبریں اور بیسوں بروج سنگ سرخ اور سنگ مرمر کے نظر آرہے ہیں۔ عمارت کی

شان سے تو معلوم ہوتا ہے کہ امرا کے مقابر ہیں، مگر جب کسی کا نام نہیں معلوم تو ایک گدا سے زیادہ گمنام ہیں۔ اندازاً دو گھنٹے میں ہم روضہ شریف میں پہنچے، وضو تھا مگر پھر تازہ وضو کیا۔ پہلے حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کے مزار منور پر حاضر ہوئے اور فاتحہ پڑھی پھر داخل مسجد ہو کر تحیۃ المسجد ادا کی اور استغفار کی تسبیح پڑھ کر درود پڑھتے ہوئے حضرت سلطان المشائخ کی تربت پاک پر حاضر ہوئے۔ تربتِ محبوب کو بوسہ دیا، آنکھوں سے لگایا، جالی شریف کے باہر آکر فاتحہ پڑھی اور آنکھیں بند کرکے بیٹھ گئے۔ ان بادشاہوں کے دربار میں بھیک مانگنے کا یہی طریقہ رکھا گیا ہے۔ ایسی شفقت فرمائی کہ راستہ کی تھکن سب جاتی رہی۔ آقا اور مالکوں کا یہی دستور ہے۔

خواجہ آن نیست کہ موے و میانے دارد
خواجہ آنست کہ باشد غم خدمت گارش

آپ کی تعریف اس سے زیادہ کیا کوئی کر سکتا ہے کہ آپ محبوبِ الٰہی ہیں۔ اہلِ تذکرہ نے لکھا ہے کہ آپ کے بزرگوار کا اسم گرامی احمد بن دانیال ہے۔ غزنین سے ہندوستان میں تشریف لائے اور حضرت محبوب الٰہی قصبہ بدایوں میں بماہ صفر ۶۳۴ھ ہجری میں پیدا ہوئے اور پچیس برس کی عمر میں دہلی تشریف لائے اور علمِ ظاہر کی تحصیل کی اور چندے شیخ نجیب الدین متوکل سے صحبت رہی۔ پھر بمقام قصبہ اجودھن حضرت بابا فرید الدین گنج شکر قدس سرہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پنج شنبہ کے روز شرفِ بیعت سے مشرف ہوئے اور زمانۂ دراز تک حاضر حضور رہے۔ آخر الامر آپ کو سندِ ولایتِ دہلی عطا ہوئی اور حضرت قطب جمال ہانسوی قدس اللہ سرہ العزیز کی خدمت میں روانہ کیے گئے۔ آپ نے دل میں خیال کیا کہ میں برادرِ بزرگ کی خدمت میں بھیجا گیا ہوں، مجھے کچھ تحفہ ان کے واسطے لے جانا ضرور ہے۔ آپ نے صحرا میں سے خشک لکڑیاں چن کر جمع کیں اور ان کا پشتارہ باندھ کر اپنے سر مبارک پر رکھا اور مٹی کے کلوخ جمع کیے اور ان کو اپنے سینہ بے کینہ پر رگڑ کر چکنا اور مدوّر کرکے جھولی میں بھرا اور اس کو دوش مبارک پر لٹکا لیا۔ جب حضرت قطب جمال قدس سرہ کے حضور میں حاضر ہوئے تو یہ دونوں تحفے پیش کیے اور عرض کی کہ

لکڑیاں تو آپ کا حمام گرم کرنے کو ہیں اور یہ کلوخ طہارت کو ہیں۔ مساکین کا تحفہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ حضرت قطب جمال رحمۃ اللہ علیہ آبدیدہ ہوئے اور اپنے خدام کو حکم کیا کہ یہ لکڑیاں ہماری قبر پاٹنے کے لیے ہیں اور یہ کلوخ قبر میں ہمارے سرہانے رکھے جائیں گے۔ اور حضرت سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ بھائی! دہلی کے لیے ایسے ہی شخص کی ضرورت ہے۔

فروتنی است دلیل رسیدگانِ کمال
کہ چون سوار بمنزل رسد پیادہ شود
خاکساری بھی نہ چھوڑے دے خدا جس کو عروج
آسمان پر ماہ تاباں ہے زمین پر چاندنی

وہ اولیاء اللہ جن کو مرتبہ نبوت کا خاص فیض آتا ہے وہ اسی طرح سے عروج کے بعد نزول فرماتے ہیں تا کہ مخلوق سے شیر و شکر ہو کر ان کی ہدایت کریں، جیسے جب کوئی فاضلِ اجل کسی مبتدی کو پڑھاتا ہے تو ناگزیر ابجد کی طرف توجہ کرنی پڑتی ہے۔ یہ اُسی شان کے ولی تھے کہ آسمان ہو کر زمین بن گئے تھے۔ نزول سے عروج کرنا دشوار ہے اور پھر عروج سے نزول کرنا دشوار تر ہے۔ جبروتی اور ملکوتی کیفیتیں کچھ ایسا لطف دکھاتی ہیں کہ اس کو چھوڑنا انبیا ہی کا کام ہے، ہر ولی اس مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ ایسے ہی اولیا کی شان میں حضرت نے ارشاد فرمایا ہے: علماء اُمتي کأنبیاء بني إسرائیل۔ حضرت محبوب الٰہی نے ۱۸؍ ربیع الثانی روز چہار شنبہ ۷۲۵ہجری میں وفات فرمائی ہے۔ اکانوے برس کی عمر آپ کی ہوئی۔ تاریخ وفات آپ کی یہ ہے۔

نظامِ دو گیتی شہ ما و طین سراج دو عالم شدہ بالیقین
چو تاریخ فوتش بجستم ز غیب ندا داد ہاتف: شہنشاہ دین

متفرق زمانوں میں اس قدر عمارتیں آپ کے مزار مبارک کے حلقے میں بنی ہیں کہ یہ مختصر کتاب اس کی تفصیل کی متحمل نہیں۔ جہاں مزار مبارک سے پہلے اس کا نام غیاث پور تھا، اب یہ مقام آپ کے نام نامی

سے مسمیٰ ہو گیا ہے اور بیسوں شاہزادے اور شاہزادیاں آپ کے مزار مبارک کے پائیں خوابِ ناز میں ہیں۔
جہاں آرا بیگم بنت شاہجہاں بادشاہ نور اللہ مرقدہا کی قبر بھی آپ کے پائیں ہے اور اُس پر یہ کتبہ ہے:

ھوالحی القیوم۔

بغیر سبزہ نپوشد کسے مزارِ مرا
کہ قبر پوش غریبان ہمیں گیاہ بس است

الفقیرۃ الفانیۃ جہان آرا مرید خواجگان چشت[ے] بنتِ شاہجہاں بادشاہ غازی انار اللہ برہانہ ۱۰۹۲ھ ہجری۔

محمد شاہ بادشاہ بھی اسی درگاہ عالی کے ایک کونے میں پڑے ہوئے ہیں۔ ان کی تاریخِ انتقال ۱۰۶۱ھ ہجری ہے۔ اس مجرمیں اور بھی قبریں ہیں اور حضرت محبوب الٰہی کے گنبد کے ٹھیک پائیں حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کا مزار ہے، آپ کا اصل نام ابوالحسن ہے اور آپ کے والد ماجد کا نام سیف الدین محمود ہے۔ آپ بڑے امرائے نامدار سے تھے، آخر الامر امیر سے فقیر ہو گئے اور اس فقیری کا وہ دبدبہ ہوا کہ آپ خود ہی فرماتے ہیں۔

دبدبۂ خسرویم شد بلند
زلزلہ در گور نظامی فگند

ایسا عاشقِ زار پیر کا جیسے آپ تھے، سوائے مولانا مظفر بلخی قدس سرہ کے دوسرا نہ ہوا۔ جب حضرتِ محبوب الٰہی نے رحلت فرمائی تو آپ سب مال لٹا کر فقیر ہو گئے اور تقریباً ساتویں مہینے ۲۹/ ذیقعدہ ۷۲۵ھ ہجری روز جمعہ کو آپ نے بھی وفات فرمائی۔

ے۔ تنبیہ نور چشم محمد محسن مدعمرہ: جس طریقہ میں وابستہ ہونے کا بادشاہ اور بادشاہ زادے فخر کریں افسوس ہے کہ اس طریقہ کا غلام ریاکار ہو اور دین کے پردے میں دنیا حاصل کیا چاہے۔ تم اس کا بہت خیال رکھنا۔ ریاکاری سے بڑھ کر اس طریقہ میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ فقط محمد اکبر

اب حضرت قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کا تہیہ ہے۔ کچھ تھوڑی دور پیدل چل کر گاڑی پر سوار ہوئے۔ جب ایک میل مزار مبارک رہا ادباً سواری چھوڑ دی۔ تازہ وضو کیا اور مسجد میں ظہر پڑھی۔ پھر آستانہ شریف کی طرف آنکھوں سے روانہ ہوئے۔ پہلے حضرت مولانا محمد فخر الدین فخر جہاں قدس سرہ کا مزارِ مبارک ملا، اسے بوسہ دیا اور آنکھوں سے لگایا۔

اگر بوسہ بر خاک مردان زنی
بہ مردی کہ پیش آیدت روشنی

فاتحہ پڑھی اور بیٹھ گئے ؏

زینہ زینہ رفت باید تا ببام

ہم ابو العلائیوں کو حضرت مولانا قدس سرہ سے کمال نیاز مندی کے علاوہ اتحاد طریقت ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب آپ اجمیر شریف حاضر ہوئے اور احاطۂ نور میں مراقبہ فرمایا تو یہ حکم ہوا کہ ہم سے فیض یاب ہوا چاہتے ہو تو ہمارے پاس اکبر آباد ہو کر آؤ۔ بس آپ کو معلوم ہو گیا کہ آپ حضرت سیدنا امیر ابو العلا اکبر آبادی رضی اللہ عنہ کی طرف بتمامہ متوجہ ہیں۔ حضرت مولانا نے فوراً اکبر آباد کا تہیہ فرما دیا، جب آپ اس آستانہ ملائک آشیانہ پر حاضر ہوئے تو آپ نے مزار مبارک کی چہار دیواری بالکل منہدم پائی اور باغ بھی خشک ہو گیا تھا۔ آپ نے چہار دیواری میں فوراً کام لگا دیا۔ چند ماہ آپ اس آستانہ شریف پر حاضر رہے مگر معتکف۔ اور غایت ادب سے کبھی مزار مبارک کے چبوترے پر قدم نہ رکھا۔ دروازہ شریف کی کوٹھری میں معتکف رہتے تھے۔ واقعی امر یہ ہے کہ ادب انھیں حضرات کو آتا تھا اور جس نے ادب سیکھا انھیں سے سیکھا۔

| | |
|---|---|
| کردم از عقل سوالے کہ بگو ایمان چیست | عقل در گوشِ دلم گفت کہ ایمان ادبست |
| بے ادب را بسمٰوات بقا منزل نیست | بسمٰوات بقا منزل پاکان ادبست |
| چند روزے تو در ایں خانۂ تن مہمانے | با ادب باش کہ خاصیت مہمان ادبست |

بزرگوں نے فرمایا ہے کہ ادب را در خانوادۂ فقرا بجو یا در خزانہ بادشاہ۔

## فائدہ

شیخ ابو نصر سراج رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اہل ادب کے تین طبقے ہیں: ایک تو اہل دنیا سو اکثر ادب اِن کا فصاحت و بلاغت، حفظ علوم و اسمار ملوک و اشعارِ عرب میں ہوتا ہے۔

دوسرے اہلِ دین سو اکثر ادب اِن کا ریاضتِ نفس، تادیب جوارح، حفظِ حدود، ترکِ شہوات میں ہوتا ہے۔ تیسرے اہلِ خصوصیت، سو اکثر ادب اِن کا قلوب کی طہارت، اسرار کی مراعات، عہود کی وفا، وقت کے حفظ میں ہوتا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مبارک رضی اللہ عنہ سے کسی نے پوچھا کہ آدمی کون ہے؟ آپ نے فرمایا کہ علما۔ عرض کیا گیا کہ بادشاہ کون ہے؟ کہا: زہّاد۔ استفسار ہوا: سفلی کون ہیں؟ فرمایا کہ جو دین کے عوض میں کھاوے یعنی جو دین کے پیرایہ میں دنیا کماوے۔

فرصت اگرت دست دہد مغتنم انگار — ساقی و صراحی و مغنی و سرودے
زنہار ازان قوم نباشی کہ فریبند — حق را بسجودے و نبی را بدرودے

باز آمدم باصلِ سخن، الغرض مولانا محمد فخر الدین رحمۃ اللہ علیہ کو اس فیض طریقہ ابو العلائیہ نے وہ رتبۂ اعلی بخشا کہ فخر جہاں ہوگئے۔ غزل فقیر محمد اکبر ابو العلائی۔

ہر شے میں دیکھتا ہے جلوا ابو العلا کا — رکھتا ہے اور آنکھیں شیدا ابو العلا کا
جب بند کرکے آنکھیں دیکھا اوسی کو پایا — سینے میں دل بنا ہے روضا ابو العلا کا
ہے سب سے بڑھ کر جوش و خروش اپنا — اس دل میں موجزن ہے دریا ابو العلا کا
کیوں کر کوئی سمائے اپنی نظر میں یارو — ان آنکھوں نے ہے دیکھا جلوا ابو العلا کا
اکبرؔ میں آپ اپنی آنکھوں کا شیفتہ ہوں — دیکھا ہے میں نے اِن سے روضا ابو العلا کا

اب ہم مولانا کی تربت سے رخصت ہوئے اور حضرت قطب صاحب قدس سرہ خاکِ پاک پر آنکھیں مل رہے ہیں۔

خاک مردانِ خدا باش کہ در کشتیِ نوح

ہست خاکے کہ بہ آبے نخرد طوفان را

سبحان اللہ و بحمدہ انھیں بزرگواروں کے اجساد نازنین ہیں کہ جن کو زمین نے گلدستۂ باغ جنت سمجھ کر اپنے دل میں رکھ چھوڑا ہے۔ اگر ایسے گلہاے باغِ قطبیت وولایت زیرِ زمین نہ ہوتے تو کوئی پھول زمین سے معطر اور خوش رنگ ہو کر نہ نکلتا۔ انھیں کے اجساد نازنین کی عطریت گلاب میں ہے اور انھیں اجسام معطر کی بُو باس نسرین ونسترن میں ہے۔ یہی وہ ارواح متبرکہ ہیں کہ زمانے نے جن کی قبروں پر اپنے ہاتھوں سے پھول برسائے ہیں اور تا قیامت برستے رہیں گے۔ دنیا بھر کے اہلِ کمال بادشاہوں کے مجرائی اور سلامی ہونے کی تمنا رکھتے ہیں اور ان کی وہ ذات پاک ہے کہ بادشاہان اولو العزم اِن کے جوار رحمت میں دفن ہونے کے آرزومند ہیں، ذٰلِكَ فَضْلُ اللهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ وَاللهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ۔ اس آستانہ عالی میں بھی الٰہی دروازہ کے پہلو میں شمس الدین التمش سا بادشاہ پڑا ہوا ہے اور اس کی قبر پر کوئی فاتحہ کے لیے کھڑا بھی نہیں ہوتا۔

یہ خانقاہ توکل وہ فقر عالی ہے

پڑے ہیں شاہ فقیروں کے آستانے میں

اکبر بادشاہ سا سلطان اللہ اسے جنت میں جگہ دے اور وہ اکبر آباد سے اجمیر شریف پیدل حاضر ہوا، اللہ اکبر اللہ اکبر لا إله إلا الله والله اکبر والله اکبر ولله الحمد۔ یہ اِن حضرات کے بے ریا فقر کا اثر تھا جو ان کے انتقال کے کئی سو برس بعد رنگ لایا۔ واقعی جو خاص اللہ کے واسطے بے نام ونشان ہوتا ہے اللہ تعالیٰ شانہ اس کے نام ونشان کو یوں عروج دیتا ہے۔ ہمارا مشامِ جان تو اِن خوشبوؤں سے معطر ہے۔

اپنی خاطر میں کب آتی ہے گلستاں کی بو ہم نے سونگھی ہے کسی گل کے گریباں کی بو

ابھی کنگھی نہ کرو اور بھی کھولے رہو سر دل کو غش کرتی ہے اس زلف پریشاں کی بو

حضرتِ محبوب الٰہی کے مناقب تو اس صفت پر ختم ہیں کہ وہ اللہ کے محبوب ہیں اور حضرت قطب صاحب کی تعریف اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ یہ محبوب الٰہی کے پیر کے پیر ہیں۔ حضرت قطب صاحب کی وفات ۱۴ ربیع الاول ۶۳۲ھ ہجری میں واقع ہوئی۔

ز عشقِ ناتمامِ من جمالِ یار مستغنی ست

بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روے زیبا را

آپ کے مزارِ مبارک کے حلقہ میں بڑی بڑی عمدہ عمارتیں ہیں۔ منجملہ ان کے مسجد قوت الاسلام کا ایک منارہ ہے جسے اب قطب صاحب کی لاٹ کہتے ہیں، اِس کی رفعت اہلِ سخا کی بلندیِ ہمت کی تصویر ہے۔ اسی کے سامنے سنگ سرخ کی بہت اونچی ایک محراب ہے جسے الٰہی دروازہ کہتے ہیں۔ اس کے حسن کی کیفیت استادانِ فنِ عمارت جانتے ہیں۔ بعض نادرہ فن معمار کہتے ہیں کہ یہ محراب اندلس یعنی اسپین کی اسلامی عمارتوں کا ایک نمونہ ہے جو اپنی گردن بلند کو خم کیے ہوئے نہایت حیرت سے اپنے بنانے والے کا خیال کر رہی ہے کہ یاالٰہی وہ عالی حوصلہ آج زمین کے کس پردے میں نہاں ہیں کہ میں سیکڑوں برس سے اس کا انتظار کر رہی ہوں، اُس کی صورت نظر نہیں آتی ہے۔ یورپ کا جو سیاح اس مینار اور محراب کو دیکھتا ہے متحیر ہو جاتا ہے۔ اور بعض متعصب تو گھبرا کر یہ کہہ اٹھتے ہیں کہ یہ تعمیریں اٹلی کے استادوں کے ہاتھ کی بنائی ہوئی ہیں۔ بس یہ اصول خوب ہے: بری بری چیزیں تمھاری اور اچھی اچھی ہماری۔ دنیا بھر میں جہاں کوئی کسی فن کا اچھا کاریگر ہو وہ ہمارا اور جو برا بد سلیقہ ہو وہ بے چارہ ہندوستان کے سر ٹھونک دیا گیا۔ اگرچہ یہ بات تلخ تو معلوم ہوتی ہے مگر واقعی درست بھی ہے۔ ہم مفتوح وہ فاتح۔ وہ جو کچھ کہیں درست ہے، ہم جو کچھ کہیں سراسر غلط۔ ہم نے جو اس باب میں خوب غور کی تو معلوم ہوا کہ ہمارے کردار ہی ایسے ہیں، جہاں ہماری قوم کو تمول ہوا اور عیش و آرام نے کاہل وجود کر دیا۔ نہ کبھی اپنا حساب دیکھتے ہیں، نہ انتظام کی طرف نظر۔ جائداد و املاک لوٹنے والوں کے ہاتھ میں ہے۔ مال لٹ رہا ہے، ہم بے خبر ہیں۔ پھر ہم مسلمانوں کے دن کیوں کر

پھریں۔ بادشاہی اپنے ملک کی وہ کرے گا جو بیدار ہو گا۔ جب بادشاہ بیدار ہو گا تب رعیت ٹھنڈی نیند سوئے گی اور جب ہمارا بادشاہ ہی ہر وقت خواب ناز میں ہو گا تو پھر ہماری بدنصیبی کا کیا پوچھنا ہے۔

## حکایت

مفسرین نے آیت إِنَّ اللہَ یُمْسِكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ أَن تَزُولَا وَلَئِن زَالَتَا إِنْ أَمْسَكَهُمَا مِنْ أَحَدٍ مِّن بَعْدِهِ إِنَّهُ كَانَ حَلِيمًا غَفُورًا ترجمہ: تحقیق خدا نگاہ رکھتا ہے آسمانوں اور زمینوں کو اس سے کہ ٹل جاویں اپنی جگہ سے اور اگر بفرض محال وہ اپنی جگہ سے ٹل جاویں تو نگاہ رکھ سکتا ہے ان دونوں کو کوئی سوائے خدا کے۔ تحقیق کہ وہ بردبار اور بخشنے والا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ سنا میں نے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے منبر پر کہ فرمایا: واقع ہوا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں یہ خدشہ کہ کبھی پروردگار تعالیٰ شانہ سوتا بھی ہے۔ اسی وقت ایک فرشتے کو حکم ہوا کہ وہ جگاتا رہا موسیٰ علیہ السلام کو تین شبانہ روز اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں میں دو شیشے تھے۔ یہاں تک کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اونگھے اور وہ دونوں شیشے آپس میں ٹکرائے اور چور چور ہو گئے۔ پس فرمایا پروردگار تعالیٰ شانہ نے کہ اگر میں سو جاؤں تو اسی طرح یہ زمین اور آسمان آپس میں ٹکرا کر چور چور ہو جائیں۔ اللہ اللہ سوتا سنسار جاگتا پاک پروردگار، لا تأخذہ سنۃ ولا نوم۔ ترجمہ: نہ اسے اونگھ پکڑتی ہے نہ نیند۔ یہی صفت ہمارے بادشاہوں کو اختیار کرنی چاہیے یعنی بقدر ضرورت کہ جس سے ان کا نفس ہلاکت میں نہ پڑے۔ رستہ ضرور یہ کو رفع کرنا چاہیے اور باقی اپنے کاروبار سے باخبر رہیں۔

اب ہم زیارت کا شرف حاصل کر کے اپنی فرودگاہ کوٹھی نمبر ۴ واقعہ محلہ دریا گنج کی طرف پلٹے اور بعافیت تمام پہنچ گئے۔

اب ۲۲؍ تاریخ رجب المرجب ۱۳۱۱ھ ہجری سہ شنبہ کے دن کی صبح ہے۔ پرانے قلعہ اور ہمایوں کے مقبرے کی دھن بندھ گئی اور سواری کوٹھی کی برساتی میں حاضر ہے ع

دل افگندیم بسم اللہ مجریھا ومرساھا

پانی برس چکا ہے، غضب کی سردی ہے۔ اول پرانا قلعہ معروف بہ دین پناہ ملا۔ ہم اور محمود عزیز مولوی محمد حمید اللہ خاں مد عمرہ کا خدمت گار صدر دروازے سے داخل ہوئے۔ اس کی محراب پر بخط نسخ لا إلہ إلا اللہ محمد رسول اللہ لکھا ہوا ہے اور اسی قلعہ کے دو دروازے اور ہیں۔ ان کی محرابوں پر گھوڑے کی تصویریں بنی ہوئی ہیں۔ اس قلعہ کے اندر کی شاہی عمارتیں بالکل مسمار ہوگئی ہیں۔ دیہاتی طریقہ سے اس میں کچھ لوگ ہندو مسلمان آباد ہیں۔ چہار دیواری جا بجا مسمار ہوگئی ہے۔ مگر ایک مسجد اس میں ہے، اس کی مرمت انگریزوں نے کرادی ہے۔ یہ عمارت پرانی قطعہ کی ہے، مگر بہت مستحکم۔ ۶۵ قدم جنوباً و شمالاً ہے اور غرباً و شرقاً ۳۸ قدم معلوم ہوتا ہے کہ پہلے صحن اس کا بہت وسیع تھا، اب جو انگریزوں نے مرمت کرائی ہے تو صحن کو کچھ کم کر دیا ہے۔ امام کی محراب میں دہنی طرف نیچے سے اوپر کو ہوتی ہوئی بہاری خط نسخ میں سورہ الحمد سنگ مرمر کی تختیوں میں منبت ہے اور اسی محراب کے اور بازوں میں آمنے سامنے سبحان اللہ اور حسبی اللہ لکھا ہوا ہے۔ اور اسی محراب کے اوپر جو سنگ مرمر کی بڑی محراب ہے اس میں آیت لِلّٰہ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَإِن تُبْدُوا مَا فِي أَنفُسِكُمْ تا عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ لکھا ہوا ہے۔ اور اس محراب کے اوپر جو اس سے بڑی تیسری محراب ہے اس میں سورہ یسین شریف لکھی ہوئی ہے۔ اس مسجد کے پانچ گنبد ہیں، چار ادھر ادھر کے چھوٹے اور بیچ کا گنبد بہت بڑا ہے۔ جنوب کی طرف کے اخیر گنبد کے اندر وار کی محراب میں سورہ ألم تر کیف اور پورا رکوع لو أنزلنا هذا القرآن لکھا ہوا ہے۔ اسی محراب کے بیچ میں سنگ مرمر کی تختی پر اوپر لا إله إلا الله محمد رسول الله لکھا ہوا ہے اور اسی کے نیچے لا إله إلا الله إبراهيم خليل الله تحریر ہے اور اس محراب سے ملی ہوئی ہے۔ جو شمال کی طرف دوسری محراب ہے اس پر بھی تمام آیات قرآنی کندہ ہیں اور یہ سب خط بہاری میں ہیں جو کوفی شان سے ملا ہوا ہے۔ نہایت مشکل سے پڑھا جاتا ہے۔ اس کے لیے بہت وقت چاہیے اور یہاں ضیق فرصت۔ شمال کی طرف کے پہلے محراب میں سورہ بقرہ کا پہلا رکوع تحریر ہے، یہ تو پڑھا گیا اور باقی نہ پڑھا گیا۔ اسی طرح تمام مسجد کے اندر اور باہر کی محرابوں میں کلام اللہ

شریف کی سورتیں تحریر ہیں۔ اب دس بج گئے، دو رکعتیں نفل کی مسجد میں پڑھیں اور بانیِ مسجد کی روح پر فاتحہ پڑھی اور باہر آئے۔ اس قلعہ کا حال اہل تاریخ نے یہ لکھا ہے کہ راجا اننگپال نے یہ قلعہ سمّت چار سو انیتس میں بنایا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ سمّت چار سو چالیس میں، واللہ اعلم بالصواب۔

اب ہمایون کے مقبرے کو جاتے ہیں۔ اس کا سنگِ مرمر کا گول گنبد ہے جو نیم دائرے سے کچھ زیادہ ہے نظر آرہا ہے۔ ہم چند منٹوں میں یہاں پہنچ گئے۔ اس مقبرے کا باغ اب تو ویران پڑا ہوا ہے، جب کبھی آباد ہو گا تو واقعی سیر کے قابل ہو گا۔ اس مقبرے اور باغ کو ہمایوں بادشاہ کی زوجہ حاجّہ بیگم نے سولہ برس میں پندرہ لاکھ روپیہ کے صرف سے بنوایا ہے۔ حمیدہ بانو بیگم اس کا نام تھا اور مریم مکانی لقب تھا۔ یہ بیگم اکبر بادشاہ کی ماں تھی۔ اب ہم اس چونہ گچ کے چبوترے پر ہیں جو باغ کے وسط میں ہے۔ اس کو ناپا تو ایک سو پچاس قدم عرض میں اور اتنا ہی طول میں ٹھہرا اس چبوترے پر ایک اور چبوترا ہے، اندازاً تین قد آدم بلند ہو گا، یہ سنگ سرخ کا ہے۔ اس کے نیچے جو حجرے بنے ہوئے ہیں اس میں عالمگیر ثانی فرخ سیر دارا شکوہ اور سوائے ان کے اور بہت سے شہزادے اور شاہزادیوں کی قبریں ہیں۔ یہاں کا پہلا چبوترہ تاج گنج کے اس پہلے سنگ سرخ کے چبوترے کے مقابل سمجھنا چاہیے جس پر مسجد اور تسبیح خانہ ہے۔ وہ چبوترہ اس سے دونا بڑا ہے اور یہاں کے سنگ سرخ کے چبوترے کے جواب میں تاج گنج کا سنگ مرمر والا بڑا چبوترہ ہے۔ وہ بھی اس سے بڑا ہے یعنی یہ ایک سو پندرہ قدم ہے اور وہ ایک سو ستائیس قدم ہے اور پھر وہ سنگ مرمر کا ہے اور یہ سنگ سرخ کا۔ اب بارہ دری اور دونوں گنبدوں کا مقابلہ ہے، اس مقبرے کے گنبد کے نیچے کی بارہ دری ۲۰ قدم عرض اور بیس قدم طول میں ہے اور تاج گنج کے گنبد کی نیچے والی بارہ دری ۳۰ قدم عرض و طول میں کچھ زیادہ ہے۔ یورپ کے سیاح جو فن تعمیر میں دستگاہ کامل رکھتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ یہ گنبد دنیا میں اول درجہ کا شمار کیا گیا ہے۔ روما جسے عرب رومۃ الکبری کہتے ہیں اور اب وہ اٹلی کے نام سے مشہور ہے، اس کا بڑا گرجا جو سینٹ پٹر کے نام سے مسمّٰی ہے، وہ اپنے گنبد کی بلندی کے واسطے تمام یورپ میں مشہور ہے۔ مگر اہل انصاف یورپین اس گنبد کو اس پر ترجیح دیتے ہیں۔ تاج گنج کا گنبد مخروطی نما ہے۔ ایسی اونچی اور شاندار عمارت کے

واسطے ایسا ہی گنبد موزوں تھا۔ ہمایوں کے مقبرے کا گنبد دور سے اندر کو دبا ہوا معلوم ہوتا ہے اور تاج گنج کا گنبد ابھرا ہوا نظر آتا ہے۔ ہر چند تاج گنج کی عمارت ہمایوں کے مقبرے کا اصلاح شدہ نقشہ ہے، لیکن شاہجہاں نے جا بجا ایسی خوبصورت اصلاح دی ہے کہ جدت کا لطف آگیا ہے۔ مگر اس بات کا ہم کو اقرار ہے کہ جو گنبد نیم دائرے سے بہت زیادہ ترشا ہوا ہو، اس کا لداؤ بہت مشکل ہے اور مخروطی گنبد کا بوجھ آڑے پتھروں پر بہت بَٹ جاتا ہے۔ مگر تاج گنج کی مجموعی عمارت اور صنعت میں اور ہمایوں کے مقبرے میں ایسا فرق ہے جیسے شہر کا ایک طرح دار جوانِ طناز اور گاؤں کا ایک قوی القوی شخص۔ شاہجہاں کی عمارت کا یہ اصول تھا کہ بیلداروں سے شروع ہوتی تھی اور جوہریوں پر ختم ہوتی تھی۔ تاج گنج کی تعمیر کی بعض صنعتیں مجھے عزیزی شیخ انعام اللہ ابوالعلائی مدعمرہ نقشہ نویس نے بتائیں (انھیں کے جد اعلیٰ عیسیٰ خاں نقاش تاج گنج کے میر عمارت تھے)۔

اب دوپہر ہوگئی۔ ہم فرودگاہ کی طرف پلٹتے ہیں۔ راستہ میں شیخ محمد صاحب کی بائیں ملی، یہاں کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ حضرت شیخ محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہاں مزار مبارک ہے۔ آپ کی وفات سنہ ۱۱۱۵ ہجری میں ہے۔ آپ کے پوتے حضرت شاہ صابر بخش رحمۃ اللہ علیہ تھے، جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے اور ایک پوتے آپ کے جن کا نام حافظ نور محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہوا، تھے اور وہ حضرت مولانا فخر الدین رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ ہیں۔ اکبر آباد محلہ کچہری گھاٹ میں آسودہ ہیں۔ ان کی اولاد سے ہمارے بھائی منشی شیخ محمد فخر الدین صاحب ابوالعلائی اور برادران محمد مصطفیٰ اور ابوالحسن و فضل الدین و وجیہ الدین سلمہم اللہ تعالیٰ ہیں۔ الحمد للہ علی احسانہ کہ ہم بخیریت تمام اپنی فرودگاہ پر پہنچ گئے۔ کھانا کھایا، استراحت کی۔ بعد ظہر بھجلا پہاڑی قریب درگاہ شاہ ترکمان مکرمی سید میر حسن صاحب رضوی مالک اخبار خیر خواہ عالم کی ملاقات کو روانہ ہوئے۔ یہ بزرگ نہایت خلیق اور متواضع ہیں، کیوں نہ ہوں، سیادت کا اثر کہاں جائے اور آپ کے برادر بزرگ محبی و مشفقی سید محمد نواب میر قادری اور رنگ کے آدمی ہیں۔ ان کو قلب سے بھی تعلق ہے۔ میں ان سے مل کر بہت خوش ہوا، نہ میں ان سے واقف تھا اور نہ یہ مجھ سے۔ برادرم مولوی محمد حمید اللہ خاں

مد عمرہ کی ساچق کے روز نواب سرور جنگ بہادر کے مکان پر ملاقات ہوگئی اور باخود دہا معرفت بھی ہوگئی۔ یہاں سے جو اٹھے تو محلہ ٹوکری والان میں مولوی محمد عبد الرحمن راسخ مالک اخبار بے مثال پنچ سے ملے۔ یہ نوجوان خوش فکر اور ذہین آدمی ہیں۔ معلومات شاعری بہت اچھی ہے، زبان تو دہلی ہی کی ہے، میرے خیال میں اب یہ دہلی کے منتخب شعرا میں سے ہیں۔ یہ مجھ سے مل کر خوش ہوئے اور میں ان سے مل کر محظوظ ہوا۔

آج ۲۳؍ رجب المرجب ۱۳۱۱ھ روز چہار شنبہ ہے۔ ہم حضرت شاہ محمد فرہاد ابو العلائی قدس سرہ کے مزار مبارک کی زیارت کو جاتے ہیں۔ محبی و مکرمی شاہ امیر حسین صاحب صابری کی گاڑی ہے اور وہ خود بھی میرے ساتھ ہیں۔ پہلے فتحپوری مسجد میں پہنچے اور عزیزی شاہ محمد رمضان ابو العلائی داناپوری سلمہ اللہ تعالیٰ کو ہمراہ لیا اور کھاری باؤلی کی سڑک سے لاہوری دروازے سے گذرے۔ صدر بازار کو بہت آباد دیکھا، بساطیوں کی بہت دکانیں ہیں۔ یہ بازار کلکتہ کے کولوٹولہ سے مشابہ ہے۔ اس بازار سے گذر کر ہندوراؤ کے باڑے کے نیچے نیچے ریل کے پل پر سے گذرے اور نہر کے داہنی طرف کی پٹری پر ہو لیے اور مغرب کی طرف بڑھے۔ تھوڑی دور آگے چل کر چھنا مل کا باغ داہنے ہاتھ کی طرف نہر کی پٹری سے ملا ہوا نظر آیا۔ نہایت آراستہ و پیراستہ ہے، اس میں پھولوں کے درختوں کے گملے ایسے خوش اسلوبی سے سجے ہوئے دیکھے جیسے حیدر آباد دکن کے باغ عامہ میں۔ اسی باغ سے ملا ہوا حضرت قطب الارشاد مولانا شاہ محمد فرہاد ابو العلائی قدس رہ کا باغ جنت نشان ہے۔ ہر چند یہ باغ نامکمل اور بہت مختصر ہے، مگر اس کی شادابی اور وسعت کا حال اہل قلب سے پوچھنا چاہیے یا اس طریقہ عالیہ ابو العلائیہ کے غلاموں سے۔ میری آنکھوں میں تو اس باغ کی فضا ایسی معلوم ہوئی جیسے جنت کی ایک کیاری۔ جنت کے معنی بہشت کے ہیں اور اصل میں ایسے بستان کو کہتے ہیں کہ جس کے درختوں نے اس کی زمین کو چھپا لیا ہو یعنی درخت اس کے شاداب اور گھنے ہوئے ہوں۔ اور عربی کے جس لفظ میں جیم و نون ہو اس میں خِفَا اور پوشیدگی کے معنی کا لحاظ رہتا ہے۔ الغرض میں نے اس متبرک باغ کو ایسا سبز اور گھنا ہوا پایا کہ بے تکلف زبانِ دل پر یہ بات آگئی کہ ھذا جنت العشاق۔ اس فقیر بے بضاعت کا طریقہ آپ ہی کی ذات مبارک تک منتہی ہوتا ہے۔ مجھ کو جو یہ لطف یہاں آیا تو وہ تعجب خیز امر نہ تھا، اس

لیے کہ اپنے باپ دادا سب کو اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ مگر حیرت انگیز امر یہ تھا کہ بعض وہ لوگ کہ جن کو کسی طریقہ سے کوئی واسطہ نہیں وہ بھی یہی کہہ اٹھے کہ ہم کو تو یہ باغ باغ جنت معلوم ہوتا ہے۔ لیکن افسوس اس امر کا ہے کہ یہ بقعہ نور ایک ہندو کے قبضے میں ہے۔ بہت سے مزارات تو نا معلوم ہو چکے ہیں اور اکثر معدوم ہوتے جاتے ہیں۔ اور میں فقیر متوکل کیوں کر اس باغ کو ان سے خرید لوں، اللہ تعالیٰ شانہ اس مزار مبارک کا حافظ ہے۔ حضرت قطب الارشاد شاہ محمد فرہاد قدس سرہ کو حضرت سیدنا امیر ابو العلا اکبر آبادی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک واسطہ درمیان میں ہے، چونکہ میرے حضرت پیر و مرشد بر حق مولانا سید شاہ محمد قاسم ابو العلائی داناپوری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ کا مفصل حال کتاب نجات قاسم میں تحریر فرمایا جو مطبع شوکت شاہجہانی آگرہ میں مل سکتی ہے اور قیمت ا روپیہ ۴ آنے مع محصول ہے۔ لہذا میں نے آپ کے حالات تحریر کرنے کی جرات نہیں کی۔ جو شائق ہوں وہ اس مبارک کتاب میں ملاحظہ فرمائیں۔ آپ نے ۲۵ر جمادی الثانی ۱۰۳۵ھ ہجری میں رحلت فرمائی۔ بہت دیر تک ہم یہاں حاضر رہے۔ چونکہ یہاں ٹھہرنے کا کوئی مقام نہیں ہے، لہذا بعد نماز ظہر یہاں سے فرودگاہ کی طرف پلٹے۔ یہاں بعد نماز عصر کچھ احباب آ گئے، دیر تک اولیاء اللہ کا تذکرہ رہا۔ میری ایک کتاب جس کا نام تاریخی ”تلقین طریقت“ ہے، یہ رسالہ بیان سلوک میں ہے اور چوبیس تلقینوں پر منقسم ہے۔ اس کا مسودہ میرے ساتھ تھا پڑھا گیا، سب نے بالاتفاق پسند کیا اور اس کے طبع کرانے کے بارہ میں بہت بڑا اصرار ہوا۔ لہذا میں نے اس کتاب کو عزیزی منشی محمد عبد الغفار خاں ابو العلائی اکبر آبادی سلمہ اللہ تعالیٰ مالک مطبع شوکت شاہجہانی آگرہ کو دے دی۔ عزیز موصوف نے اسے اپنے خرچ سے طبع کرا لیا ہے اور قیمت صرف دس آنہ ہیں۔ محصول ڈاک ذمہ خریدار ہے۔ میرے اکثر احباب نے پسند فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ شانہ اس کو اثر قبولیت عطا فرمائے، آمین ثم آمین۔

اب کل کی تاریخ کو میں اکبر آباد شریف واپس جاتا ہوں۔ سفر میرا اتمام ہوا۔ بعض احباب نے مجھ سے فرمائش کی ہے کہ حضور پر نور ہز ہائنس آصف جاہ نظام دکن خلد اللہ ملکہ کی شادی عنقریب ہونے والی

ہے۔ تم کو ایک سہرا کہنا ضرور ہے۔ میں نے بخوشی خاطر قبول کی اور قلم برداشتہ چند شعر لکھے ہیں، وہ زینت کتاب کے خیال سے رونق افروز خاتمۂ کتاب ہوتے ہیں۔ وھوھذا۔

**سہرا حضور پرنور آصف جاہ سلطان دکن خلد اللہ ملکہ**

محبوب ہے سلطان دکن، خوب ہے سہرا
محبوب ہے محبوب ہے محبوب ہے سہرا

خوش خلق ہے نوشاہ، خوش اسلوب ہے سہرا
کیا خوب ہے، کیا خوب ہے، کیا خوب ہے سہرا

ہے عارض سلطان دکن سورۂ والشمس
والشمس کی تفسیر ہے، کیا خوب ہے سہرا

نوشاہ کو ہم کیوں نہ کہیں یوسفِ ثانی
نورِ نظر حضرت یعقوب ہے سہرا

نواب(۸) وقار الامرا کو ہو مبارک
سلطان دکن حضرت محبوب ہے سہرا

کیوں دیکھوں نہ اکبر اسے الفت کی نظر سے
محبوب کا ہم راز ہے، محبوب ہے سہرا

**سہرا دیگر**

رخِ نوشہ پہ فضل حق سے ہے ایمان کا سہرا
نہ کیوں سرتاج سہروں کا ہو یہ سلطان کا سہرا

حضور اور اس پہ رخ پرنور، پھر اس پر یہ سہرا ہے
تجلی پر تجلی ہے یہ عرفان کا سہرا

نظر ہوتی ہے خیرہ جب جواہر جگمگاتے ہیں
بنا ہے آفتاب اس خسروی ایوان کا سہرا

شہنشاہِ دکن کے روے روشن پر جگہ پائی
غلاف اب بے تکلف بن گیا قرآن کا سہرا

دکن میں شادیانہ گانے کو حورانِ خلد آئیں
مبارک ہو الٰہی ہے بڑے ارمان کا سہرا

سر شاہ دکن پر ہے رسول اللہؐ کا دامن
درود اس پر پڑھیں ہم ہے یہ ایسی شان کا سہرا

مرا نوشاہ نقادِ سخن ہے آپ اے اکبرؔ
کہوں کیا اپنے منہ سے میں یہ ہے کس شان کا سہرا

---

۸۔ یہ شعر سرخی کا ہے۔ غلطی سے لکھا گیا۔

## دیگر

ہے سر پہ باندھنے کو شاہِ مہربان سہرا
خدا کے فضل سے اب ہوگا دُرفشاں سہرا

ضرور ہے کہ یہ شاہِ دکن کے سر پر ہو
بنا ہے سایۂ سلطانِ انس و جاںؐ سہرا

ستارے موتی ہیں شاہِ دکن کا منہ ہے چاند
بنا ہے آج کی شب رشکِ آسماں سہرا

ہم اپنی آنکھوں میں اس کو چھپا کے رکھیں گے
کہیں چرا کے نہ لے جائے کہکشاں سہرا

زمین پہ دھوم ہے اس کی فلک پہ شور اِس کا
یہ فیضِ شاہ سے پہنچا کہاں کہاں سہرا

سر حضور دکن پر ہوئی اسے معراج
لگا کے موتیوں کی پہنچا نردبان سہرا

یہ مثل دامن محبوب بڑھ کے پہنچا ہے
ہے داناپور کہاں اور ہے کہاں سہرا

چمک جو پہنچی ہے اس موتیوں کے سہرے کی
نہ لائی اپنا خجالت سے کہکشاں سہرا

برس رہا ہے یہ ابر بہار کی صورت
عجیب شان سے ہے رخ پہ گلفشاں سہرا

جمال عارض نوشہ نے کر دیا اسے ماند
ہوا تجلّی رخسار میں نہاں سہرا

یہ نور ہے کہ کسی کو نظر نہیں آتا
نظر کے سامنے ہے اور ہے نہاں سہرا

بندھا ہے سر پہ جو صاحب جمال کے اکبرؔ
دکھا رہا ہے جمالی تجلیاں سہرا

## قطعہ تاریخ کتاب سیر دہلی تصنیف جناب منشی فقیر محمد خاں صاحب اکبرآبادی

ہیں مؤلف اس کتابِ خاص کے
مرشدِ آفاق و عالی جاہِ دہر

مہبطِ انوارِ ارشاد و ہُدا
نجمِ گیتی مہر عالم ماہِ دہر

صحت و تحقیق سے لکھا ہے خوب
حال مردانِ خدا آگاہِ دہر

لکھ یہ انورؔ سالِ تاریخِ کتاب
سیر دہلی ہے تماشا گاہِ دہر

۱۳۱۱ہجری

## غزل من تصنیف جناب حاجی الحرمین شریفین حضرت سید شاہ محمد اکبر مدظلہ شاہ صاحب سجاد نشین خانقاہ داناپور شریف

وہ کریں پھر ادھر الفت کی نگاہیں کیوں کر
آنے جانے کی کہیں دیکھیے راہیں کیوں کر

بڑھ گیا ضعف بہت کھینچیے آہیں کیوں کر
ناتوانی کا نہیں حکم، کراہیں کیوں کر

چھید ڈالا مرے سینے کو برنگِ غربال
جینے دیں گی مجھے ظالم یہ نگاہیں کیوں کر

کوچۂ عاشق کی ہے بھول بھلیاں کچھ اور
آپ کو یاد ہوں اے خضر یہ راہیں کیوں کر

ہو گئی ہم کو بھی الفت سی کچھ اپنے دل سے
آپ چاہیں جسے، ہم اس کو نہ چاہیں کیوں کر

جب یہ اوٹھتی ہیں تو بس ضعف بٹھا دیتا ہے
آئیں سینے سے لبوں تک مری آہیں کیوں کر

کیا سبب ہے کہ تمھیں پاسِ مروت نہ رہا
جانِ جاں پھر گئیں مجھ سے یہ نگاہیں کیوں کر

عاشقوں کی تو نظر میں بھی ہے ہوتی تاثیر
بے اثر رہ گئیں بلبل تری آہیں کیوں کر

چشمِ بد دور مجھے خود نظر بد کا ہے ڈر
ڈالوں اس عارض رنگین پہ نگاہیں کیوں کر

آئینہ سامنے ہے دیکھ نہ لو اپنا جمال
اب یہ فرماؤ کہ ہم تم کو نہ چاہیں کیوں کر

اے زلیخا! مری آنکھیں تری آنکھیں تو نہیں
کوئی یوسف ہو تو ہو، ہم اوسے چاہیں کیوں کر

کچھ سبب ہے جو مرے طائر دل پر ہو گریں
بن گئیں باز تری چور نگاہیں کیوں کر

کیا کہیں پڑ گیا ہے اک بتِ خود کام سے کام
سخت تشویش ہے الفت کو نباہیں کیوں کر

جانِ جاں! رشتہ محبت کا بہت نازک ہے
آپ توڑیں جسے، ہم اس کو نباہیں کیوں کر

آئینہ میں نے بھی اس دل کو بنا ہی ڈالا
دیکھوں اب پھرتی ہیں مجھ سے وہ نگاہیں کیوں کر

دونوں ہاتھوں سے بجا کرتی ہے تالی اکبر
ہم اکیلے ہی محبت کو نباہیں کیوں کر

## ختم شد

# اراکین مجلس ادبیات عالیہ

اردو کے مخلص، سچے اور بے لوث خادم جنھوں نے اردو ادب عالیہ کی یونی کوڈ سازی میں اپنا تعاون پیش کیا

آصف انظار ندوی، کانپور
ابوذر قوی، لکھنؤ
اسامہ احمد ندوی، بھٹکل
اسامہ نفیس، لکھنؤ
اقبال احمد ندوی، سہرسا
الشفاء
انعام الحق ندوی، بھٹکل
اوشو، مشرقِ وسطیٰ
ایس ایس ساگر
تفسیر حسین، دہلی
ثقلین حیدر، دہلی
ثمرین زارا
جاسمن، کراچی
راشد مرتضیٰ، سیتامڑھی
سحر عرف مخمل ابراہیم
رشیدہ

شفیع اللہ خان، بالاپور
شمشاد، سعودی عرب
صابرہ امین
طلحہ نعمت
عاطف علی، سعودی عرب
عبد الحمید اطہر ندوی، بھٹکل
عبد الرحمن، دہلی
عبد الرؤوف
عبد الصمد چیمہ
عبد القادر، بھوپال
عبد اللہ نیموی، بیگوسرائے
عبد المعید خاں ندوی، ممبئی
عبید رضا، پنڈی گھیپ
عزیر فلاحی، بھوپال
عطاء اللہ سنجری، کیرالا
علقمہ

لا ایلما
محب علوی، لاہور
محمود الرحمن، دیوبند
میر عابد علی، میدک
محمد عاکف، بھٹکل
محمد شاہد خان، لکھنؤ
محمد اکرم قاسمی، ناگپور
محمد راشد ندوی، امراوتی
وصی اللہ، بہرائچ
محمد ندیم ندوی، امراوتی
ملک احمد ندوی، لکھنؤ
محمد عامر ندوی، ودیشا
محمد ابان، بھٹکل
محمد محسن خاں ندوی، کلکتہ
محمد زید، بہرائچ
محمد اطہر ندوی، مالیگاؤں

ناشر

| | | |
|---|---|---|
| رومی | فضل الرحیم، دہلی | محمد عمر، انگلستان |
| سفیان الحسینی، لکھنؤ | فیصل انس، حیدر آباد | محمد عدنان اکبری نقیبی |
| سمعان خلیفہ ندوی، بھٹکل | فرحت کیانی | مومن فرحین |
| سمیع اللہ خاں، کوکن | فرید الحسن، کراچی | مقدس، انگلستان |
| سیما علی | قرۃ العین اعوان | ماہی احمد |
| شعیب گناترا | گل یاسمیں، اسکینڈی نیویا | نور وجدان |

ناشر
اردو محفل فورم